’فرائض دینی کا جامع تصور‘

کے موضوع پر

قرآن اکیڈمی‘ ماڈل ٹاؤن‘ میں منعقدہ

چھ روزہ محاضرات

(۲۳ تا ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء)

کی تفصیلی روداد

از قلم: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

۞ محاضرات کے لیے شائع شدہ ہینڈ بل کا عکس

۞ عریضہ بنام علماء کرام

۞ میرے تصورِ فرائضِ دینی کا خلاصہ

شائع شدہ، حکمت قرآن، مارچ، اپریل ۱۹۸۵ء

۞ رودادِ محاضرات

شائع شدہ، حکمتِ قرآن، مئی ۱۹۸۵ء

۞ خطبۂ جمعہ، مسجد دارالسلام، باغ جناح، لاہور

۲۹/ مارچ ۱۹۸۵ء

مشتمل بر

——— تذکرہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

——— محاضرات کی شاندار کامیابی پر اظہارِ تشکر

——— مولانا سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد، آزاد کشمیر) کا تعارف

——— اور ان کی تقریر کے ایک اہم نکتے کی وضاحت

(شائع شدہ میثاق، مئی ۱۹۸۵ء)

ان شاء اللہ اس سال قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں

۲۳ تا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء روزانہ بعد نماز مغرب

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام سالانہ

محاضراتِ قرآنی

کا موضوع:

''قرآن کا تصورِ فرائض دینی''

ہوگا، جس میں ان شاء اللہ العزیز جملہ مکاتب فکر کے جید علماء کرام حصہ لیں گے۔

ذیلی عنوانات: عبادتِ ربّ، شہادت علی الناس، اقامت دین

جہاد فی سبیل اللہ، التزامِ جماعت، بیعت سمع وطاعت

ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!"

''حکمت قرآن'' مارچ۔اپریل ۱۹۸۵ء

عریضہ بنام علماءِ کرام

محترم و مکرم جناب ——————————

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

جناب کے علم میں ہے کہ راقم الحروف اللہ کی کتابِ حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اس کے دینِ متین کا ایک حقیر خادم ہے۔ اُس نے ایک انجمن ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' کے نام سے ۱۹۷۲ء میں قائم کی تھی جس کا وہ تاحیات صدر رہے۔ اور ایک دینی جماعت ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے ۱۹۷۵ء میں قائم کی تھی جس کا وہ امیر ہے!

انجمن کے جملہ وابستگان اور تنظیم کے تمام شرکاء ظاہر ہے کہ راقم ہی کے دروسِ قرآن اور تحریروں اور تقریروں سے متأثر ہو کر راقم کے معاون و مددگار بنے ہیں —— لیکن 'الحمدللہ' کہ میرا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اپنے رفقاء و معاونین کو صرف اپنے ہی مہم و فکر کے حصار میں محصور نہ رکھوں' بلکہ وسیع تر حلقے سے ذہنی و فکری استفادے کی تلقین بھی کروں اور اس کے مواقع بھی پیدا کروں —— چنانچہ انجمن کے زیر اہتمام جو سالانہ ''قرآن کانفرنسوں'' اور ''محاضراتِ قرآنی'' کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا ہے اور اُن میں جملہ مکاتب فکر کے علماء کرام اور اصحابِ علم و فضل حصہ لیتے رہے ہیں تو اس سے دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیش نظر رہا ہے کہ وابستگانِ انجمن اور رفقاءِ تنظیم کا ذہنی افق وسیع ہو اور وہ جس راہ پر چلیں، علیٰ وجہ البصیرت، چلیں!

اس سال ''محاضراتِ قرآنی'' کے ضمن میں راقم نے طے کیا ہے کہ اصحابِ علم و فضل کو اپنے دینی فکر' بالخصوص ''تصورِ فرائض دینی'' پر تنقید کی دعوت دے تاکہ اگر انہیں اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اُس کی نشاندہی فرمائیں' بصورت دیگر تائید و تصویب سے نوازیں' —— اس مقصد کے لیے راقم نے اپنی دینی سوچ' خصوصاً اپنے تصورِ فرائض دینی کا ایک ''خلاصہ'' مرتب کیا ہے جو جناب کی خدمت میں اس عریضے کے ساتھ ارسال ہے!

جیسے کہ جناب منسلکہ اوراق میں ملاحظہ فرما لیں گے کہ راقم کا تصور فرائض دینی چھ عنوانات کے ذیل میں مندرج ہے۔ تین اساسی فرائض' اور تین ان کے لوازم'—— ادھر محاضرات بھی ان شاء اللہ چھ یوم جاری رہیں گے۔ بنا بریں مناسب تقسیم یہ رہے گی کہ روزانہ ایک ایک عنوان زیر بحث آئے' چنانچہ اگر جناب ان میں سے کسی ایک عنوان پر اظہار خیال فرمانا چاہیں تو اگر دنوں کی ترتیب کے لحاظ سے پروگرام بنالیں تو انسب ہوگا' اگر بحیثیت مجموعی پورے تصور فرائض پر گفتگو کرنی مقصود ہو تو وہ کسی بھی دن کی جا سکے گی۔ بہر حال اس ضمن میں کوئی چیز بھی ''شرط'' کے درجے میں نہیں ہے!

اسی طرح ''ان شاء اللہ العزیز'' سوائے ایک وقت کی پابندی کے اور کوئی پابندی کسی مقرر پر نہیں ہوگی اور آزادانہ اظہارِ خیال کا پورا موقع ہوگا —— اس ضمن میں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ ان اجتماعات میں راقم خود بھی سراپا گوش رہے گا اور امکانی حد تک ''استفادے'' کی کوشش کرے گا اور صورت ہرگز کسی بحث مباحثے کی نہیں بنے گی۔

آخر میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لیے ضرور وقت نکالیں۔ اس لیے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی' خصوصاً جبکہ اُس کا محرک و داعی خود اس کے لیے مستدعی ہو ایک اہم دینی فریضہ ہے!—— بصورت دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی' جناب ہی نے توجہ نہ فرمائی۔ فقط والسلام مع الاکرام۔

رہنمائی کا طالب
خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ
لاہور۔۱۲/فروری ۸۵ء

(نوٹ: یہ عریضہ کم وبیش یک صد علماء کرام کی خدمت میں ارسال کیا گیا)

میرے تصورِ فرائض دینی کا خلاصہ

۞ تمہید: انسانی شخصیت کے دو رخ ہیں: ایک علم دوسرے عمل۔ اسلام میں علم صحیح کا مظہر اتم ''ایمان'' ہے جبکہ عمل صحیح کی اساس ''تصورِ فرائض'' پر قائم ہے۔ ''ایمان'' انسان کو علم حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا صحیح محرکِ عمل بھی دیتا ہے۔ اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے' چنانچہ ایمان کی ماہیت' اس کی تفاصیل' اس کے درجات' اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے لوازم و ثمرات اہم ترین موضوعات ہیں' لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ ''تصورِ فرائض دینی'' پر ہے!

۞ راقم کے نزدیک ایک مسلمان کے ''اساسی دینی فرائض'' تین ہیں:

(۱) ایک یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

☆ اس کے لیے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام' اطاعت خدا و رسولؐ' تقویٰ اور عبادت۔

☆ یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جزوی یا جزوقتی —— اِلّا یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یا جذبات کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے' تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں لازماً مقبول ہوگی (النساء:۱۷) —— اس کے برعکس اگر جان بوجھ کر کوئی ایک ''معصیت'' بھی مستقل طور پر اختیار کر لی گئی اور اس پر توبہ کی بروقت توفیق نہ ملی تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے بلکہ جہنم میں داخلے' حتیٰ کہ ''خلود فی النار'' تک کا اندیشہ ہے (البقرۃ:۸۱) اِلّا یہ کہ حقیقی اور واقعی ''اضطرار'' ہو!!

(۲) دوسرے یہ کہ دوسروں کو حتی المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے!

☆ اس کے لیے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں جیسے انذار' تبشیر' تذکیر' وعظ' نصیحت' وصیت' تعلیم' تبیین' تلقین۔

☆ لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں: تبلیغ‘ دعوت‘ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی الناس۔

☆ یہ خود انسان کی اپنی شرافت ومروت کا تقاضا بھی ہے اور ابنائے نوع کی ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا بھی‘ لیکن سب سے بڑھ کر یہ سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے اتمامِ حجت یعنی ’’شہادت علی الناس‘‘ کی ذمہ داری بحیثیت مجموعی اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کندھوں پر ہے!

(۳) تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس کے دین حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لیے تن‘ من‘ دھن سے کوشاں ہو۔

☆ اس کے لیے قرآن حکیم کی چار اساسی اصطلاحات ہیں: تکبیر رب‘ اقامت دین‘ اظہار دین الحق علی الدین کلہٗ اور لیکون الدین کلہ للّٰہ

☆ حدیث نبویؐ میں ایک پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے: لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا ـــــ اور

☆ تین عام فہم تعبیرات ہیں: قیامِ حکومت الٰہیہ‘ نفاذِ نظامِ اسلامی اور اسلامی انقلاب!

متذکرہ بالا تین فرائض کی باہمی نسبت اور ان کے ایمان اور ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط وتعلق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہو جاتا ہے جس کی ـــ (i) ایک زیر زمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دارومدار اسی پر ہے۔ (ii) اسی بنیاد کا ایک حصہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں ’’کرسی‘‘ اور انگریزی میں plinth کہتے ہیں۔ (iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں‘ دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اُوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے۔ (iv) ان ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے (v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے (vi) اس کے اوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اس کا بھی معاملہ یہی ہے ـــــ!

اس مثال میں:

(ا) زیر زمین بنیاد ـــ ایمان کا ’’تصدیق بالقلب‘‘ والا حصہ یعنی یقین قلبی ہے!

(ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصہ ـــــ ''اقرارٌ باللسان'' ـــــ یعنی کلمۂ شہادت ہے!
(ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔
(د) پہلی چھت اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے۔
(ہ) دوسری چھت ـــ تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی الناس سے عبارت ہے ـــــ اور
(ز) تیسری اور آخری چھت تکبیر رب، اقامت دین، اظہارِ دین، اعلاءِ کلمۃ اللہ یا قیامِ حکومت الٰہیہ کی مظہر ہے! واللہ اعلم!

۞ ان تین اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تین لوازم لابدمنہ ہیں:

(ا) دوام ''جہاد فی سبیل اللہ'' جس کا ظہور:

☆ فریضہ اوّل کے ضمن میں (i) نفس امارہ (ii) شیطانِ لعین اور اس کی ذریت صلبی و معنوی اور (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے غلط رجحانات اور دباؤ ـــــ کے خلاف جدوجہد اور زور لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اور حدیثِ نبویؐ کی رو سے یہی ''افضل الجہاد'' ہے۔

☆ فریضہ ثانی کے ضمن میں دعوت وتبلیغ کے لیے جان و مال کھپانے کی صورت میں ہوتا ہے، اور:

☆ فریضہ ثالث کے ضمن میں سر دھڑ کی بازی لگانے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کی قوتوں سے ''بالفعل'' اور ''بِالیَد'' پنجہ آزمائی کی صورت میں ہوتا ہے جس کے لیے تن، من، دھن لگا دینے کا عزم، حتیٰ کہ جان دے دینے کی ''آرزو'' کا ہونا لازمی ہے!

گویا جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس اور آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے!

واضح رہے کہ اسی کا ''منفی پہلو'' ہجرت ہے،

چنانچہ اس کی بھی پہلی منزل ''اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ'' ہے اور آخری یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد میں وقت آنے پر گھر بار، مال ومنال اور اہل وعیال کو چھوڑ کر نکل جایا جائے!

جہاد کی پہلی دو منزلوں کے لیے اصل آلہ وہتھیار قرآن مجید ہے یعنی ''جہاد بالقرآن'' چنانچہ ''مجاہدہ مع النفس'' کا مؤثر ترین ذریعہ ہے قرآن کے ساتھ قیام اللیل یا تہجد! اور دعوت وتبلیغ کا پورا عمل بھی قرآن حکیم ہی کی اساس پر اور اسی کے

ذریعے ہونا چاہیے!!

تیسری اور آخری منزل پر عہد حاضر میں ''جہاد بالید'' کی موزوں ترین صورت فواحش ومنکرات کے خلاف پرامن مظاہرے ہیں' لیکن اس میں نوبت فقہاء کرام کی طے کردہ شرائط کے تحت' قتال یعنی ''جہاد بالسیف'' تک بھی آ سکتی ہے۔

(۲) لزومِ اجتماعیت' جس کا تقاضا:

☆ فریضہ اوّل کے ضمن میں صرف صحبت صالح (بفحوائے: ''کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ'') سے بھی پورا ہوسکتا ہے!

☆ اسی طرح فریضہ ثانی کے ضمن میں درسگاہوں' اداروں' انجمنوں اور سوسائٹیوں سے پورا ہوسکتا ہے!

☆ لیکن فریضہ ثالث کے ضمن میں ''سمع و طاعت فی المعروف'' کے ٹھیٹھ اسلامی اور عسکری اصول پر مبنی جماعت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا (اور یہی مراد ہے آنحضورﷺ کے ان الفاظ مبارکہ سے کہ: ''آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ'' (احمد' والترمذی' عن الحارث الاشعریؓ)

(۳) بیعت ـــــ جو : ـــــ

☆ پہلے دو فرائض کے ضمن میں ''بیعت سلوک و ارشاد'' کی صورت میں کفایت کرتی ہے' لیکن

☆ فریضۂ ثالث کے ضمن میں ''بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' کی صورت لازمی و لابدی ہے! چنانچہ اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے مسلمؒ کی روایت (عن عبداللہ ابن عمرؓ) سے جس میں آنحضورﷺ کے یہ الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ ''مَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِهٖ بَیْعَةٌ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً ـــ!'' ـــــ واضح رہے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں: (i) اگر کم سے کم شرائط و معیارات پر اُترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اُس کے سربراہ سے بیعت سمع و طاعت ہوگی ـــــ اور (ii) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت ہوگی ـــــ

۞ چنانچہ:

(۱) انجمن خدام القران کا مقصد ہے ''جہاد بالقرآن''۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں اس کے قیام کے وقت اس کے جو ''اغراض و مقاصد'' معین ہوئے وہ یہ تھے: (۱) عربی زبان کی تعلیم و ترویج (۲) قرآن مجید کے مطالعہ کی عام ترغیب وتشویق (۳) علوم قرآنی کی عمومی نشر واشاعت؛ (۴) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت جو ''تعلیم وتعلم قرآن'' کو مقصد زندگی بنا لیں ——— اور (۵) ایک ایسی ''قرآن اکیڈمی'' کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے؛ اور

(۲) ''تنظیم اسلامی'' ہے ''جملہ دینی فرائض'' کی انجام دہی کے لیے ''بیعت ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ وسمع وطاعت فی المعروف'' پر مبنی خالص دینی جماعت!!

میں نے اپنا مافی الضمیر کھول کر بیان کر دیا ہے اب علماء کرام اور اصحابِ دانش کا فرض ہے کہ رہنمائی فرمائی!

خاکسار **اسرار احمد**

ع بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش!

فکرِ اقبال

کی روشنی میں

حالاتِ حاضرہ

اور

ہماری قومی ذمہ داریاں

خطاب بہ مجلس اقبال

الحمرا آڈیٹوریم ——————— ۲۱/اپریل ۸۶ء

از

اسرار احمد

بانی تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سالانہ محاضراتِ قرآنی

کی روداد اور

شرکاء کے موقف کا جائزہ

(از قلم: ڈاکٹر اسرار احمد)

(شائع شدہ ''حکمت قرآن'' مئی ۱۹۸۵ء)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام جو سالانہ ''محاضراتِ قرآنی'' اس سال ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء' قرآن اکیڈمی' ماڈل ٹاؤن' لاہور میں منعقد ہوئے ——— ان کے لیے جن علماء کرام کو بلاواسطہ یعنی انجمن کے دفتر سے براہِ راست' یا بالواسطہ یعنی بعض مقامات کے رفقاء واحباب کی معرفت دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے ان کی کل تعداد لگ بھگ ایک صد تھی۔

ان میں سے جن حضرات نے بالفعل شرکت فرمائی ان کی تعداد ۲۱ ہے۔ جن میں ایک تقسیم تو اس اعتبار سے ہے کہ دس حضرات کا تعلق لاہور سے ہے' آٹھ کا بیرونِ لاہور لیکن اندرونِ پاکستان سے اور تین کا ہندوستان سے ——— اور ایک دوسری تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے دو تہائی یعنی پندرہ حضرات بلاشک وشبہ ملک گیر شہرت کے حامل اور مختلف مکاتب فکر کے علماء وزعماء کی صف اول سے متعلق ہیں اور ایک تہائی تعداد نسبتاً نوجوان علماء پر مشتمل ہے ——— ان حضرات کے اسماءِ گرامی حسب ذیل ہیں:

——— لاہور سے ———

(۱) مولانا محمد مالک کاندھلوی (۲) مفتی محمد حسین نعیمی

(۳) حافظ عبدالقادر روپڑی (۴) سید محمد متین ہاشمی

(۵) پروفیسر حافظ احمد یار (۶) ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
(۷) حافظ عبدالرحمٰن مدنی (۸) قاری سعید الرحمٰن علوی
(۹) ڈاکٹر خالد علوی (۱۰) حافظ نذر احمد

—— بیرون لاہور سے ——

(۱) مفتی سیاح الدین کاکاخیل (اسلام آباد) (۲) سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد)
(۳) سید عنایت اللہ شاہ بخاری (گجرات) (۴) مولانا عبدالغفار حسن (فیصل آباد)
(۵) مولانا عبدالوکیل خطیب (کراچی) (۶) مولانا محمد اسحاق روپڑی (کراچی)
(۷) مولانا الطاف الرحمٰن (بنوں) (۸) مولانا شبیر احمد نورانی (کراچی)

—— ہندوستان سے ——

(۱) مولانا وحید الدین خان (دہلی) (۲) قاری محمد عبدالعلیم (حیدرآباد)
(۳) میر قطب الدین علی چشتی (حیدرآباد)

راقم الحروف کے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا جا سکے کہ انہوں نے اپنی شدید مصروفیات اور وقیع مشاغل میں سے وقت نکالا اور راقم کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے شرکت فرمانے کی زحمت گوارا کی۔ بالخصوص وہ حضرات جنہوں نے سفر کی صعوبت برداشت کی، راقم اور اس کے جملہ رفقاء کے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

اس فہرست میں تین نوجوان علماء کا اضافہ تو اس پہلو سے ہے کہ ان میں سے ایک صاحب یعنی مولانا عبدالرؤف (خطیب آسٹریلیا مسجد، لاہور) جو باضابطہ مدعو تھے، ایک دن تشریف لائے تو وقت کی کمی کے باعث راقم نے ان سے معذرت کر لی اور اگلے دن کا وعدہ لے لیا لیکن دوسرے روز وہ تشریف نہ لا سکے —— ایک صاحب یعنی کوٹ رادھا کشن کے مولانا عبدالحکیم سیف صاحب، جنہوں نے از خود حصہ لینے کی خواہش کی اور مقالہ پیش کیا۔ اور ایک صاحب، یعنی اکبر الدین قاسمی جو اپنے ذاتی جذبے اور شوق کے تحت حیدرآباد دکن سے تشریف لائے، لیکن چونکہ آخری وقت پہنچ پائے لہٰذا عملاً حصہ نہ لے سکے —— راقم ان تینوں حضرات کا بھی تہ دل سے ممنون ہے —— اور ایک بزرگ شخصیت یعنی مولانا سعید احمد اکبر

آبادی کا اس اعتبار سے کہ اگرچہ وہ شرکت کی شدید خواہش کے باوجود اپنی شدید علالت اور معا لجین کی قطعی ممانعت کے باعث تشریف تو نہ لا سکے لیکن ان کا ایک پینتیس منٹ کا ٹیپ شدہ خصوصی پیغام اور انٹرویو پہلے اجلاس میں سنوایا گیا—— گویا سلسلۂ محاضرات کا ''افتتاح'' اسی سے ہوا —— اس طرح مولانا موصوف کی بھی ''بالفعل'' نہیں تو ''بالقوہ'' شرکت ان محاضرات میں ہوگئی۔ اس حساب سے ان محاضرات کے ''شرکاء'' کی کل تعداد ۲۵ بنتی ہے۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ ٹھیک یہی تعداد ان حضرات کی ہے جنہوں نے مصروفیت یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر شرکت سے معذرت کی' یا مزید برآں اجمالی تائید وتصویب سے بھی نوازا' یا بھرپور تائید وتحسین فرمائی یا اجمالی اختلافات کا اظہار فرمایا یا بعض نکات پر تفصیلی اختلافی تحریریں ارسال فرمائیں —— یا شدید اظہارِ بیزاری واعلانِ براءت فرمایا! عجیب تر اتفاق یہ ہے کہ ان میں سے بھی بائیس حضرات تو وہ ہیں جنہیں ہماری جانب سے دعوت نامہ ارسال ہوا تھا اور تین وہ ہیں جنہوں نے از خود ''کرم'' فرمایا اور اپنے جذبۂ نصح و اخلاص کے تحت ہماری ''رہنمائی'' کی خدمت سرانجام دی —— راقم الحروف ان تمام حضرات کا بھی بلا استثناء تہہ دل سے ممنون ہے اور اپنی اور اپنے جملہ رفقاء کی جانب سے ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہے —— عمومی دلچسپی کے لیے ان حضرات کے اسماء گرامی کی فہرست بھی ذیل میں درج کی جارہی ہے:

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (لکھنؤ)
(۲) مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ)
(۳) مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)
(۴) مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور)
(۵) مولانا سید شمس پیرزادہ (بمبئی)
(۶) مولانا نورالحق ندوی وازہری (پشاور)
(۷) حضرت مولانا خان محمد (کندیاں شریف)
(۸) مولانا گوہر رحمان صاحب (مردان)
(۹) مولانا محی الدین لکھوی (دیپالپور)
(۱۰) مولانا محمد اسحٰق صدیقی (کراچی)
(۱۱) مولانا سمیع الحق (اکوڑہ خٹک)
(۱۲) مولانا عبدالحق حقانی (اکوڑہ خٹک)
(۱۳) مولانا قاضی شمس الدین (گوجرانوالہ)
(۱۴) مولانا محمد طاسین (کراچی)
(۱۵) مولانا بدیع الدین شاہ (پیر جھنڈا' سندھ)
(۱۶) مولانا محمد یوسف لدھیانوی (کراچی)
(۱۷) مولانا محمد ازہر (ملتان)
(۱۸) مولانا محمد عبداللہ (اسلام آباد)
(۱۹) سید اسعد گیلانی (لاہور)
(۲۰) مولانا نعیم صدیقی (لاہور)
(۲۱) حافظ احسان الٰہی ظہیر (لاہور)
(۲۲) پروفیسر طاہر القادری (لاہور)

(اور از خود ''کرم'' فرمانے والے) (۲۳) جناب جاوید احمد (لاہور)
(۲۴) جناب عبدالمجیب (کراچی) اور (۲۵) جناب محمد عبداللہ (لاہور)

راقم الحروف ایک بار پھر ان تمام حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے اور اُمید رکھتا ہے کہ آئندہ بھی یہ حضرات اسی طرح تعاون فرماتے رہیں گے' بقول غالبؔ ؎

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے!

اس سال کے ''محاضرات'' متعدد اعتبارات سے منفرد شان کے حامل تھے:

اوّلاً —— اس اعتبار سے کہ مسلسل چھ دن روزانہ ساڑھے تین چار گھنٹے ایک ہی موضوع پر اوسطاً روزانہ چار حضرات نے اظہارِ خیال فرمایا' لیکن آخر وقت تک نہ مقررین کے جوش و خروش میں کوئی کمی آئی نہ سامعین کے ذوق وشوق اور دلچسپی ہی میں کسی کمی کا احساس ہوا۔

ثانیاً —— حاضرین و سامعین کی تعداد بھی گزشتہ سالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ رہی۔ حالانکہ قرآن اکیڈمی شہر سے بہت دور اور ٹریفک کے ذرائع کے اعتبار سے بہت الگ تھلگ جگہ پر واقع ہے اور رات کے نو دس بجے کے بعد وہاں سے واپسی کے لیے کسی چیز کا دستیاب ہونا بہت دشوار ہے۔ تاہم اس کا ایک ظاہری سبب یہ تھا کہ چونکہ اسی موقع پر اور اُسی جگہ ''تنظیم اسلامی پاکستان'' کا سالانہ اجتماع بھی ہو رہا تھا اور ساڑھے تین صد کے قریب لوگ تو وہاں مستقل مقیم ہی تھے' لہٰذا شہر سے روزانہ دو ڈھائی صد حضرات کی شرکت سے بھی بھرپور جلسے کا سماں بندھ جاتا تھا۔

ثالثاً —— اور اہم ترین یہ کہ ان محاضرات کے ''موضوعِ بحث'' کے طور پر قرآن حکیم کے ایک طالب علم اور اللہ کے دین متین کے ایک خادم نے' جو دینی و ملی خدمات کے میدان میں ایسا نو وارد بھی نہیں بلکہ لگ بھگ چالیس برس سے سرگرمِ عمل ہے اور تقریباً بیس سال سے تو اپنی انفرادی سوچ اور آزادانہ نقطۂ نظر کے ساتھ بحمد اللہ پوری تندہی کے ساتھ دینی خدمت میں مشغول ہے' اپنے دینی فکر کا ''لبّ لباب'' اپنے مطالعے کا نچوڑ اور بالخصوص اپنے ''تصورِ فرائض دینی کا خلاصہ'' متعین الفاظ میں مرتب کر کے پیش کیا تھا۔ اور اس پر ''موافقین'' اور ''مخالفین'' سب کو آزادانہ اظہار خیال کی کھلی دعوت دی تھی۔ راقم نے جب اس کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ کوئی بہت انوکھا اور نادر کام کرنے چلا ہے۔ لیکن جب محاضرات کے دوران بلا استثنائے واحد جملہ مقررین و مقالہ نگار حضرات' بالخصوص ''ناقدین'' و ''مخالفین'' نے برملا اعتراف کیا کہ ''ایسا کم از کم معلوم تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے!'' اور ''اس

وسعت قلب کی کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی!'' اور ''عام طور پر تو لوگ اختلاف کرنے والوں کو اپنے پلیٹ فارم کے قریب تک بھی پھٹکنے نہیں دیتے!'' اور ''یہ ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے!'' اور ''اُمید ہے کہ اس سے بہت اچھی اور مبارک و مستحسن روایت قائم ہوگی اور مفید نتائج برآمد ہوں گے''۔ وغیرہ وغیرہ —— تو راقم کے قلب کی گہرائیوں سے شکر خداوندی کا جذبہ بالکل (امام راغب کی بیان کردہ مثال کے مطابق) ''عینٌ شکریٰ'' کی سی کیفیت کے ساتھ ابھرا۔ اور راقم نے اپنے اس اقدام کی برکات کو جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور توفیق ہی کی بنا پر ممکن ہوا تھا چشم باطن ہی نہیں سر کی آنکھوں سے بھی دیکھا۔ فَلِلّٰہِ الحمد و المنة!!!

رابعاً —— یہ کہ محاضرات کے پورے سلسلے کے دوران نہایت خوشگوار فضا قائم رہی اور خالص افہام وتفہیم کا ماحول برقرار رہا۔ چھ دن میں کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی تلخی یا ناخوشگواری کی پیش نہیں آئی۔ حالانکہ سامعین کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو راقم کے دروس وخطابات اور تحریر وتقریر سے متأثر ہو کر اس کے رفیق وشریک کار اور اعوان وانصار بنے ہیں —— اور دُور ہی دُور سے کسی کا متفق یا مداح ہونا دوسری بات ہے' کسی دینی کام میں عملی شرکت اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ اس کے داعی وقائد کے ساتھ صرف اتفاقِ رائے اور ہم خیالی ہی نہیں کسی نہ کسی درجہ میں محبت وعقیدت کا تعلق قائم نہ ہو جائے —— ادھر ان محاضرات کے دوران راقم کے دینی فکر پر شدید تنقیدیں ہی نہیں ہوئیں اس کے بارے میں استہزائیہ انداز بھی اختیار کیا گیا لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل واحسان ہے کہ راقم اور اس کے ساتھیوں نے یہ سب کچھ نہایت خندہ پیشانی اور صبر وتحمل کے ساتھ سنا اور ایک لمحے کے لیے بھی تلخی و ناگواری تو دور کی بات ہے ماحول پر تکدر بھی طاری نہ ہونے دیا بلکہ اس کے برعکس بحمد اللہ وبفضلہٖ ایک شگفتگی کی سی کیفیت مسلسل طاری رہی! —— ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ!

یہ ناقابل یقین کیفیت ایسے ہی پیدا نہیں ہوگئی بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو بروقت کچھ فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائی —— جو یہ ہیں:

ایک یہ کہ راقم نے محاضرات کے آغاز سے ہفتہ عشرہ قبل ہی ''بالکل'' اس طرح جیسے نماز یا روزہ سے قبل نیت ''باندھی'' جاتی ہے اپنی اس نیت کو شعوری طور پر پختہ کیا کہ میں ان محاضرات کے دوران علماءِ کرام کے ارشادات کو اپنے فکر کے جملہ صغریٰ کبریٰ اور تمام تانے بانے کو امکانی حد تک ذہن سے نکال کر مقدور بھر کھلے کانوں سے سنوں گا اور کھلے دل و دماغ

کے ساتھ ان پر غور کروں گا اور اگر مجھے کہیں کوئی ''روشنی'' ملی اور دل نے گواہی دی کہ میں نے کسی معاملے میں افراط وتفریط سے کام لیا ہے تو اس کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے اپنی پوری سوچ کو از سرِ نو استوار کرنے سے دریغ نہ کروں گا۔ پھر میں نے یہ ''نیت'' صرف ''سرًّا'' ہی نہیں ''جھرًا'' اور ''علانیۃً'' علیٰ رؤس الاشہاد بھی کی چنانچہ اپنے خطابِ جمعہ میں مسجد دارالسلام' باغ جناح' لاہور کے بھرے مجمع میں اس کا اعلان کیا —— جدید سائیکالوجی کے ماہرین خواہ اسے ''خود تلقینی'' (auto suggestion) سے تعبیر کریں' لیکن میں نے اس طرزِ عمل کو بہت مفید پایا ہے اور میرے نزدیک یہی حکمت نماز کے لیے نیت ''باندھنے'' یا روزہ کے لیے نیت کے مسنون الفاظ زبان سے ادا کرنے کی ہے! —— بہرحال اپنے اسی شعوری فیصلے کے منطقی نتیجے کے طور پر راقم نے بعض ایسے تنظیمی امور سے متعلق فیصلوں کو بھی ملتوی کر دیا جن کا اعلان اسی سالانہ اجتماع کے موقع پر ہونے والا تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے صاف عرض کر دیا کہ ان معاملات پر اب ان محاضرات کے بعد از سرِ نو غور ہوگا! —— اپنے اسی فیصلے پر باحسن وجوہ عمل کرنے کے لیے راقم نے اپنے لیے طے کر لیا تھا کہ اس کی حیثیت ان محاضرات میں محض ''سامع'' کی ہوگی۔ اگر کسی موقع پر ناگزیر ہی ہو گیا تو صرف خالص استفہامی انداز میں سوال کر لوں گا۔ اپنے اس فیصلے کی اہمیت کا احساس بھی راقم الحروف کو اس وقت ہوا جب مولانا وحید الدین خاں صاحب نے دہلی سے آمد کے فوراً بعد فرمایا کہ اس قسم کے موضوعات پر بحث کھلے مجمعوں میں ہونی درست نہیں ہے اور اس پر راقم نے عرض کیا کہ اس میں میری حیثیت صرف ''سامع'' کی ہوگی۔ اگر شدید ضرورت محسوس کی تو بھی میں صرف سوال کروں گا جوابی تقریر ہرگز نہیں کروں گا تو وہ فوراً مطمئن ہو گئے —— (عجیب حسن اتفاق یا سوءِ اتفاق ہے کہ پورے محاضرات کے دوران راقم نے صرف ایک سوال کیا اور وہ مولانا وحید الدین خاں صاحب ہی سے تھا' اور اس پر جب انہوں نے صاف اعتراف کر لیا کہ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے!! اگرچہ اس سے ان کی تقریر کا تأثر مجروح ہو گیا لیکن میرے دل میں ان کی محبت وعظمت پہلے سے دوچند ہو گئی!!

دوسرے یہ کہ راقم نے محاضرات کے آغاز سے ایک دن قبل رفقائے تنظیم اسلامی کے اجتماع میں اسی کی تلقین اپنے رفقاء کو کی' بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کا حکم دیا کہ (i) جملہ علماء کرام —— خواہ وہ ہمارے موافق ہوں یا ناقد ہمارے محسن ہیں' ان کی تشریف آوری ایک عظیم تعاون ہے' لہٰذا ان کا ادب پورے طور پر ملحوظ رہے۔ (ii) ان کی تقاریر کو کھلے کانوں

—— اور کھلے دلوں کے ساتھ سنیں اور کھلے ذہن کے ساتھ ان پر غور کریں۔ اگرچہ جذباتی طور پر متأثر ہونا درست نہ ہوگا' بلکہ ہمیں ان کے دلائل کو اپنے دینی فکر کے صغریٰ کبریٰ کے ساتھ تقابل کر کے پورے شعور و ادراک کے ساتھ رد یا قبول کرنا ہے ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ (iii) محاضرات کے دوران نظم پوری طرح برقرار رہے —— اور کسی ناگواری کیا بے چینی تک کا اظہار نہ ہو' اختلافی باتیں پورے صبر و تحمل سے سنیں اور سوالات بھی صرف بغرض استفہام ہوں۔ ان میں نہ ''جارحیت'' ہو نہ ''جرح'' کا انداز!!

راقم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے اور اس کے رفقاء کو ان فیصلوں پر الفاظِ ظاہری اور روح باطنی دونوں کے اعتبار سے بتمام و کمال عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ ؎

''ایں سعادت بزورِ بازو نیست!
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!''

بدقسمتی سے اس تصور کا دوسرا رخ اتنا شاندار نہیں ہے۔ راقم الحروف ع ''خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!'' کے مصداق علماء کرام بالخصوص اکابر علماء سے معذرت کے ساتھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ ان کا ادب و احترام اپنی جگہ' محاضرات میں شرکت کی صورت میں ان کے تعاون و احسان کا بارِ گراں برحق' لیکن ان کی اکثریت نے موضوعِ بحث کا حق ادا نہیں کیا۔ اور اکثر و بیشتر نے صرف متفق علیہ امور پر وعظ و نصیحت پر اکتفا کی۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ ان کے عظمت و کردار کی مظہر ہے کہ بعض حضرات نے بلا عذر اعتراف کیا اور بعض نے متعین عذرات کی بنا پر وضاحت فرمائی کہ وہ اصل موضوع پر بحث کی تیاری کا حق ادا نہ کر سکے اور ان شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر مزید تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بات کریں گے —— چنانچہ بعض حضرات نے اس قسم کے مباحث و مذاکرات کے لیے ایک مستقل فورم یا پلیٹ فارم کے قیام کی تجویز پیش فرمائی —— راقم کے لیے یہ بات نہایت خوش آئند ہے۔ اس لیے کہ اس کا ذہن اور مزاج ابتدا ہی سے یہی ہے' اور اگرچہ اپنے کام میں شدید مشغولیت و انہماک کے باعث وہ علماء کرام سے ذاتی سطح پر زیادہ ربط ضبط قائم نہ رکھ سکا لیکن اس نے ''قرآن کانفرنسوں'' اور ''محاضراتِ قرآنی'' کے ذریعے دراصل اسی نوع کے مشترک پلیٹ فارم کے قیام کی سعی کی ہے۔ پھر تنظیم اسلامی میں ''حلقۂ مستشارین'' کا قیام بھی اس کے اسی اندازِ فکر اور افتادِ طبع کی عکاسی کرتا ہے۔ اور جب اور جہاں ممکن ہوتا ہے وہ علماء

کرام کی خدمت میں طالب علمانہ حاضری کو اپنی سعادت سمجھتا ہے! وَاللّٰہُ عَلٰی مَا اَقُوْلُ وَکِیْلٌ!! ——— بہرحال اس سال کے محاضراتِ قرآنی ان شاءاللہ العزیز اس سلسلے میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوں گے اور خاص اس موضوع پر مزید مجالس مذاکرہ کا انعقاد انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہے گا۔ بید اللّٰہ التوفیق والتیسیر۔

آئندہ مزید غور وفکر کے دروازے کو کھلا رکھتے ہوئے' ان محاضرات کی حد تک راقم الحروف کو اپنے عجز بیان' بالخصوص اندازِ تحریر کی خامی سے پیدا شدہ چند غلط فہمیوں پر تنبیہ کے سوا اپنے اساسی موقف کی کسی غلطی یا اپنے فکر کے صغریٰ کبریٰ کی کسی خامی یا اُن سے حاصل شدہ نتائج کے ضمن میں کسی افراط یا تفریط کا سراغ نہیں ملا ——— بلکہ اس کے برعکس راقم کو ان امور کے ضمن میں متعدد علماء کرام کی جانب سے نہایت زوردار تصویب وتائید حاصل ہوئی ہے اور بحمداللہ ان محاضرات کے نتیجے میں راقم اپنے موقف پر پہلے سے زیادہ جازم و عازم ہے!——— تاہم جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مزید گفت وشنید اور بحث وتمحیص کا سلسلہ پوری ذہنی وقلبی آمادگی کے ساتھ جاری رہے گا۔

راقم کو اپنے عجز بیان ——— اور اظہار مافی الضمیر کی کوتاہی کا یوں تو مستقلاً ہی اقرار و اعتراف ہے' تاہم ان محاضرات کی موضوعِ بحث تحریر کا معاملہ یہ ہے کہ یہ بہت رواداری میں لکھی گئی تھی' لہٰذا اس میں بعض فاش غلطیاں ایسی ہوگئیں جنہوں نے شدید مغالطوں کو جنم دیا' چنانچہ ان میں سے بعض کا راقم نے جمعہ ۲۲ مارچ کو مسجد دارالسلام میں خطاب جمعہ میں اعتراف و اعلان بھی کر دیا تھا۔ تاہم چونکہ مقررین حضرات تو وہاں موجود نہ تھے۔ لہٰذا مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں کہ اکثر ناقدین نے ان ہی کو اپنے اظہارِ خیال کا موضوع بنایا ——— بہرحال راقم ان کے شکریے کے ساتھ ان امور کے ضمن میں اپنے اصل موقف کو درج ذیل کر رہا ہے:

(۱) ان میں سب سے پہلی ''غلطی'' یہ ہوئی کہ راقم نے علماء کرام کے نام اپنے خط کے آخر میں یہ الفاظ استعمال کر دیے کہ:

> ''آخر میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لیے ضرورت وقت نکالیں۔ اس لیے کہ کسی دینی خدمت وتحریک کی بروقت رہنمائی' خصوصاً جبکہ اُس کا محرک وداعی خود اس کے لیے

مستدعی ہو ایک اہم دینی فرض ہے!—— بصورت دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی' جناب ہی نے توجہ نہ فرمائی۔''

اب اسے میں اپنی بدقسمتی کے سوا اور کسی چیز پر محمول نہیں کر سکتا کہ بعض علماء کرام نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ میں گویا اس کا مدعی ہوں کہ میں نے ان پر ''اتمامِ حجت'' کر دیا ہے کہ وہ میری تنظیم میں شامل اور میری بیعت میں داخل ہوں۔ ''معاذ اللہ'' ع ''یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے!'' اور حاشا وکلا میرے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے!

(۲) دوسری اہم غلطی یہ ہوئی کہ راقم نے ایک مسلمان کے تین اساسی دینی فرائض میں سے اوّلین یعنی ''یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!'' کی وضاحت کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۱ کا جو حوالہ دیا اس سے بجا طور پر مغالطہ ہوا کہ شاید میں بھی معتزلہ کی طرح 'عصاۃِ اہل ایمان' کے لیے ''خلود فی النار'' کے امکان کا قائل ہوں۔ میں اس سے بھی اظہارِ براءت کرتا ہوں۔ میرے نزدیک صحیح بات وہی ہے جو احادیث صحیحہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے' یعنی جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو گا اگر اس کے گناہوں کا وزن نیکیوں سے بڑھ کر ہوا تو وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا بھگت کر بالآخر دوزخ سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس مقام پر اس آیۂ مبارکہ کا حوالہ بے محل اور غلط ہے —— رہا یہ سوال کہ اس آیت کا صحیح مدلول میرے نزدیک کیا ہے تو میرے نزدیک یہ آیت اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے ان احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مشابہت رکھتی ہے جن میں تنبیہہ اور ترہیب کی غرض سے بعض اعمال پر نفی ایمان کی وعید سنائی گئی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ کے ضمن میں نہ یہ روش درست ہے کہ ان کے ظاہری الفاظ سے بالکل قانونی اور منطقی معانی نکالے جائیں جس سے شدید مایوسی پیدا ہو جائے' نہ یہ صحیح ہے کہ ان کی ایسی توجیہیں کی جائیں کہ ان کی تاثیر ہی ختم ہو کر رہ جائے اور بے خوفی اور لاپرواہی جنم لے لے! بلکہ دوسری آیات واحادیث کی روشنی میں ان کی ایسی تعبیر کی جانی چاہیے جس سے سامع اور قاری میں ''بین الخوفِ والرّجاء'' کی کیفیت قائم رہے۔ واللہ اعلم——

بہرحال اس مسئلے کا اصل تعلق ایمان اور عمل کے باہمی لزوم یا عدم لزوم اور ایمان میں کمی بیشی کے امکان یا عدم امکان کے ضمن میں اس اختلاف سے ہے جو ہمارے یہاں اسلاف سے چلا

آ رہا ہے اور جس کے ضمن میں تا حال راقم کی رائے یہ ہے کہ اس دنیا کی حد تک اور قانونی و فقہی سطح پر صحیح بات یہی ہے کہ ایمان جدا ہے اور عمل جدا' اور نفس ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی لیکن حقیقت کے اعتبار سے صحیح بات یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ ایمانِ حقیقی یعنی یقین قلبی گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی بلکہ ایمان اور عمل صالح لازم وملزوم ہیں اور یہ لزوم دو طرفہ ہے' یعنی ایمان بڑھے گا تو عمل صالح میں بھی لازماً اضافہ ہوگا اور معاصی میں لامحالہ کمی آئے گی اور ایمان گھٹے گا تو عمل صالح میں کمی واقع ہوگی اور معاصی میں اضافہ ہوگا اور اسی طرح عمل صالح بڑھے گا تو اس سے ایمان میں بھی اضافہ ہوگا اور عمل صالح میں کمی آئے گی اور معاصی بڑھیں گے تو اس سے ایمان بھی متأثر ہوگا اور اس میں لازماً کمی آئے گی ——— اور ——— اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے اپنی پناہ میں رکھے ——— بہر حال اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ امکان کے درجے میں یہ احتمال موجود ہے کہ اعمالِ صالحہ کے مسلسل فقدان اور معاصی پر دوام و اصرار بالخصوص اکل حرام پر جان بوجھ کر استمرار و مداومت کے نتیجے میں ایمان کی پونجی بالکل ختم ہو جائے اور احادیثِ نبویہؐ میں وارد شدہ الفاظ: ((لَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ))——— یا ((آیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ..... وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّـہٗ مُسْلِمٌ .....)) کا مصداق وجود میں آ جائے!!——— اور ظاہر ہے کہ اگر اسی حالت میں موت واقع ہو جائے تو ایسے شخص کا معاملہ اس کا سا نہیں ہوگا جو ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا ہو خواہ گناہوں کا بہت سا انبار اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ **هذا ما عندی حتی الوقت والعلم عند اللّٰه وارجو ان ینبهنی اللّٰه والذین اوتوا العلم ان کنت خاطیا**——!!——— بہر حال جو شخص ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا ہو خواہ اس کی مقدار کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو اس کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے اور اس کے ضمن میں میرا موقف وہی ہے جو جملہ اہل سنت کا ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پوری اُمید ہے کہ اسی پر میری موت واقع ہوگی!

(۳) تیسرا سلسلۂ مغالطات پیدا ہوا راقم کی حسب ذیل عبارت ہے:

> ''فریضۂ ثالث کے ضمن میں ''بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' کی صورت لازمی و لابدی ہے۔ چنانچہ اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے مسلم کی روایت (**عن عبد اللّٰه بن عمر رضی اللّٰه عنهما**) سے جس میں آنحضورﷺ کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ ''**من مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتةً جاهلیةً**——!'' ——— واضح رہے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں: (i) اگر کم سے کم شرائط و معیارات پر اترنے والا صحیح اسلامی نظامِ

حکومت قائم ہے تو اس کے سربراہ سے بیعت سمع وطاعت ہوگی اور (ii) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع وطاعت ہوگی —— اور تیسری کوئی صورت ممکن نہیں!''

(i) اس سے بعض حضرات نے تو یہ نتیجہ اخذ فرمالیا کہ راقم بزعم خویش اس مقام پر فائز ہوگیا ہے کہ سب مسلمانوں پر شخصاً اس کی بیعت لازم ہوگئی ہے۔ اس سے تو اسی نوع کا اظہارِ براءت کافی ہے جس نوع کا اظہارِ براءت میں ابتدا میں پہلی غلطی کے ضمن میں کر چکا ہوں —— راقم کے نزدیک حال تو کجا مستقبل میں بھی جتنی دور تک نگاہ فی الوقت جا سکتی ہے اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کسی ایک امام کی بیعت اس طرح لازم ہو جائے کہ اس کے دائرے سے باہر لازماً کفر ہو۔ اس کا نظری امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس آخری زمانے میں جبکہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزول کے بعد کوئی صورت ایسی بن جائے کہ پورے کرۂ ارضی پر ایک ہی اسلامی ریاست بالفعل قائم ہو جائے —— اس سے پہلے اس کا کوئی نظری امکان بھی موجود نہیں ہے —— کجا راقم الحروف کی بیعت! ع ''زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است''۔

(ii) ایک دوسرا مغالطہ جو میری تحریر سے پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ میں صحیح مسلمؒ کی محولہ بالا حدیث مبارک کو بالکل ظاہری اور قانونی معنوں میں لے رہا ہوں اور میرے نزدیک بیعت سمع و طاعت فی المعروف کا لزوم ہر شخص کے لیے اور ہر حال میں ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس مغالطے میں فی الواقع مبتلا رہا ہوں' لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے رفیق مکرم ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب کو کہ انہوں نے لگ بھگ چھ ماہ قبل صحیحین کی ایک حدیث کی جانب توجہ مبذول کرائی جس سے یہ ''تیسری'' امکانی صورت بھی سامنے آتی ہے کہ کم از کم معیار پر پوری اترنے والی اسلامی حکومت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں: اگر انسان کو (ا) اقامت دین کی جدوجہد کے لیے کوئی ایسی جماعت بھی نظر نہ آئے جس پر اس کا دل مطمئن ہو سکے اور (ب) خود وہ دیانتاً محسوس کرے کہ اس میں وہ ہمت و صلاحیت موجود نہیں ہے کہ خود داعی کی حیثیت سے کھڑا ہو اور ایک قافلہ ترتیب دے تو اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ انفرادی مساعی پر ہی اکتفا کرے —— چنانچہ راقم نے اس معاملے میں اپنا موقف تبدیل کر لیا تھا لیکن کچھ اس بنا پر کہ جو خیال دل میں برسوں بیٹھا رہا ہو اسے خواہ شعوری طور پر دل سے نکال بھی دیا جائے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات کچھ عرصے تک غیر شعوری طور پر برقرار رہتے ہیں —— اور کچھ اس بنا پر کہ' جیسے کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے' یہ تحریر بہت

''رواداری'' میں سپردِ قلم ہوئی تھی —— یہ الفاظ قلم سے نکل گئے کہ ''اور تیسری کوئی صورت ممکن نہیں ہے!'' بہرحال راقم اس سے محاضرات سے قبل ہی رجوع کر چکا تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ''حکمت قرآن'' میں اشاعت کے وقت یہ الفاظ حذف کر دیے گئے تھے!!

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ذاتی سطح پر میرے مشفق و مربی اور تنظیم اسلامی کی سطح پر حلقۂ مستشارین کے رکن رکین مولانا سید حامد میاں صاحب کو کہ اگرچہ وہ اپنی شدید مصروفیات کے باعث اس بار محاضرات کے لیے کوئی تحریر تو سپردِ قلم نہ کر سکے لیکن انہوں نے خاص اس غلطی پر تنبیہہ فرمانے کے لیے راقم کو طلب فرمایا اور قدرے برہمی کے انداز میں فرمایا کہ ''اس حدیث سے یہ مطلب تو کسی نے بھی نہیں لیا اور ہمارے تو اسلاف میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے نہ کسی سے بیعت سمع و طاعت کی نہ لی!'' —— تو اگرچہ فوری طور پر میرے ذہن میں ایک خیال کلبلایا کہ ''کسی شے کا عدمِ ذکر یا عدمِ ثبوت اس کے وجود کی نفی کو مستلزم نہیں ہے!'' —— (اس لیے کہ میرے علم میں استاذی المکرّم مولانا منتخب الحق قادری کا بیان کردہ یہ واقعہ ہے کہ ایک بار اچانک علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیریؒ کے ذاتی کتب خانے کی ایک خاص الماری کی صفائی کرتے ہوئے جس کی چابی وہ کبھی کسی کو نہیں دیتے تھے اور اس موقع پر کسی خاص مجبوری سے مولانا کے حوالے کی تھی' اچانک ان کی نگاہ سے ایک رجسٹر گزرا جس میں ان لوگوں کے نام اور پتے درج تھے جنہوں نے حضرت مولاناؒ سے بیعت جہاد کی ہوئی تھی —— مولانا منتخب الحق صاحب کا فرمانا ہے کہ اس روز میری سمجھ میں یہ بات بھی آئی کہ کیوں مولانا نے اپنی رہائش قبرستان میں ایک بالکل ویران و سنسان جگہ پر رکھی ہوئی تھی!) لیکن میں نے اس معاملے میں بحث کی طوالت سے بچنے کے لیے عرض کیا کہ ''مولانا! اگر اس حدیثِ نبویؐ کو ظاہری اور قانونی معنوں میں نہ لیا جائے لیکن اس کا حوالہ بیعت جہاد اور بیعت سمع و طاعت فی المعروف کے لیے تشویق و ترغیب کے طور پر دیا جائے تو.....؟'' اس پر مولانا نے فوراً بلا توقف فرمایا: ''اس میں کوئی حرج نہیں ہے!'' —— گویا موضوع زیر بحث کی حد تک اس حدیث مبارکہ کا حاصل بھی وہی ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۱ کا!!

(iii) بعض حضرات کو یہ غلط فہمی بھی لاحق ہوئی کہ شاید میرے نزدیک اگر کوئی شخص ایک بار مجھ سے بیعت سمع و طاعت فی المعروف میں منسلک ہو جائے تو پھر اگر وہ کسی بھی صورت میں اس بیعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دے گا تو ''مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ'' کی وعید شدید کا مستحق

ہوگا۔ میں اس سے بھی علیٰ رؤوس الاشہاد اعلانِ براءت کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ معاملہ اس ''الجماعة'' کا ہے جو اصلاً تو دورِ نبویؐ میں نبی اکرم ﷺ کی زیرامارت قائم تھی اور تبعاً صرف خلافت راشدہ تک قائم رہی جبکہ اُمت میں دینی و مذہبی' سیاسی وملی' ملکی و علاقائی اور حکومتی وانتظامی ہر اعتبار سے وحدت کلی برقرار رہی —— اس کے بعد سے آج تک' اور مستقبل میں دُور دُور تک اس ''الجماعة'' کا حقیقی اور واقعی اعتبار سے وجود خارج از بحث ہے۔ البتہ نظری طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پوری اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی اسی ''الجماعة'' کے حکم میں ہے!

اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے قائم ہونے والی کسی بھی جماعت میں شمولیت اور اس کے امیر سے سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت انسان پر اس وقت لازم ہوتی ہے جب دو شرطیں پوری ہو جائیں: ایک یہ کہ اس کے دینی فکر اور طریق کار سے مجموعی طور پر اتفاق ہو اور دوسرے یہ کہ اس کے خلوص واخلاص پر دل گواہی دے دے۔ پھر اس بیعت پر قائم رہنا بھی اسی وقت تک لازم ہوگا جب تک یہ دونوں باتیں برقرار رہیں —— بصورت دیگر اگر (i) انسان کے علم میں ایسے شواہد آئیں جن کی بنا پر اس خلوص واخلاص پر اعتماد متزلزل ہو جائے یا (ii) انسان دیانتاً یہ محسوس کرے کہ داعی نے جو راستہ ابتداءً اختیار کیا تھا اور جس کی اس نے دعوت دی تھی وہ اس سے منحرف ہوگیا ہے یا (iii) خود انسان کا ذہن بدل جائے اور وہ خود اس طریق کار پر مطمئن نہ رہے جس پر تحریک کا آغاز کیا گیا تھا یا (iv) اسے کوئی ایسی جماعت نظر آجائے جو اس سے بہتر طریق پر' اور اس سے بہتر قائد کی قیادت میں اقامتِ دین کی جدوجہد کر رہی ہو —— تو اس کا بیعت کو فسخ کرنا جائز ہی نہیں واجب ہو جائے گا —— اِلّا یہ کہ باطن میں پیچھے ہٹنے کا اصل سبب تو کمزوری اور بزدلی یا کوئی ذاتی مصلحت ومنفعت ہو لیکن ظاہری سہارا انسان متذکرہ بالا چار صورتوں میں سے کسی کا لے لے —— تو اس صورت میں چاہے دنیا میں اس پر کوئی حکم نہ لگایا جاسکے لیکن عنداللہ وہ ضرور قابل مؤاخذہ ہوگا! —— البتہ جب تک کسی شخص میں کسی قائد یا امیر سے بیعت سمع وطاعت کے ضمن میں وہ دونوں مثبت اساسات برقرار رہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور ان چار منفی کیفیات میں سے کوئی کیفیت پیدا نہ ہو جو فسخ بیعت کے ضمن میں بیان ہو چکی ہیں اس وقت تک اس کا اس جماعت میں شامل رہنا اور بیعت کا وہ حق ادا کرنا لازم ہو گا جو صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لاَ نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ

بِالْحَقِّ حَيْثُمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

صرف اس فرق کے ساتھ کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد ہر بیعت سمع و طاعت میں ''فِی الْمَعْرُوْفِ'' کی قید بہتر تو یہ ہے کہ لفظاً ہو ورنہ معناً لازماً مراد ہوگی!

الغرض ——

راقم ان محاضرات کے بعد بھی' ان تصریحات اور ان سے لازم آنے والی حدود و قیود کے ساتھ' فرائض دینی کے جامع تصور کے ضمن میں اپنے موقف پر جازم و عازم ہے۔ ان محاضرات کے نتیجے میں تو راقم کو اپنے موقف میں کسی اساسی اور بنیادی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اب اللہ ہی سے دعا ہے کہ اگر میرے اس فکر میں کوئی کجی یا غلطی ہے تو اپنے خصوصی فضل و کرم اور کسی خاص ذریعے سے مجھے متنبہ فرما دے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ آمِين يَا رَبَّ الْعَالَمِيْن!

راقم الحروف کو پورا احساس ہے کہ قارئین ''حکمت'' محاضرات کے جملہ بالفعل و بالقوہ اور حاضرانہ و غائبانہ شرکاء کے افکار و خیالات سے فرداً فرداً واقف ہونا چاہیں گے۔ اس ضمن میں یہ گزارش ہے کہ ہم تک تحریریں تو صرف معدودے چند حضرات کی پہنچی ہیں۔ اکثر و بیشتر حضرات نے تقاریر کی تھیں۔ مقدم الذکر حضرات سے ہم یہ درخواست کریں گے کہ وہ اپنی تحریروں پر ہماری مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں نظر ثانی فرمالیں تو بہتر ہوگا' تاکہ وقت اور قلم و قرطاس کا ضیاع کم ہو اور فائدہ زیادہ! —— اور مؤخر الذکر حضرات سے مزید درخواست یہ ہوگی کہ ہماری ان تصریحات کو بھی مدّنظر رکھ کر اپنی تقاریر کے خلاصے خود مرتب فرما دیں تاکہ انہیں سلسلہ وار شائع کر دیا جائے —— سردست مؤیدین و موافقین اور مختلفین و ناقدین کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے:

راقم کو سب سے زیادہ کھلی اور بھرپور تائید و تصویب —— بلکہ حد درجہ حوصلہ افزائی تو ملی ہے مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ سے' جو بلاشبہ برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں اور اس اعتبار سے تو ''آپ اپنی مثال'' کے مصداقِ کامل ہیں کہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور عرصہ دراز سے اس کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں اور مختلف اوقات میں دارالعلوم ڈابھیل اور مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مدرس رہے ہیں تو دوسری جانب سینٹ سٹیفن کالج دہلی کے لیکچرار' مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈین آف

تھیالوجی رہے ہیں اور ایک طرف عربی زبان اور علومِ دینیہ پر عبور رکھتے ہیں تو دوسری طرف انگریزی زبان وفکر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان سب پر مستزاد ہے ان کی ۱۹۳۸ء سے تا حال ''ندوۃ المصنفین'' دہلی کی رکنیت اور ماہنامہ ''برہان'' کی ادارت ——— اور بیسیوں اعلیٰ پایہ کی علمی کتب کی تصنیف ——— اور اب حضرت شیخ الہندؒ اکیڈمی' دیوبند کی سربراہی۔

ان کے ٹیپ شدہ خیالات تو لفظ بلفظ اور من وعن ماہنامہ ''میثاق'' کی اپریل ہی کی اشاعت میں شائع ہورہے ہیں' وہاں ملاحظہ فرمالیے جائیں لیکن عندالملاقات جو ایک ''لطیفہ'' صادر ہوا وہ تفنن طبع کے لیے حاضر خدمت ہے——— ایک ملاقات میں (مذکورہ ٹیپ شدہ انٹرویو والی نہیں' اس لیے کہ اس موقع پر تو راقم موجود نہ تھا) راقم اور اس کے دو رفقاء کی موجودگی میں مولانا نے تائید وتحسین اور حوصلہ افزائی کے ضمن میں بہت کچھ فرما کر اور ڈھیر ساری دعائیں دینے کے بعد فرمایا کہ ''بس آپ کی ایک بات سے مجھے شدید اختلاف ہے اور اس سے مجھے بہت کوفت اور تکلیف ہوتی ہے!'' اس پر راقم سہم کر ہمہ تن گوش ہوگیا تو اس مطلع کا مقطع یہ ارشاد ہوا کہ ''وہ یہ کہ آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ میں عالمِ دین نہیں ہوں..... آپ عالم ہیں' آپ خطیب ہیں' آپ ادیب ہیں.....'' راقم الحروف کو اس وقت ان کی شخصیت میں حضرت شیخ الہندؒ کے مزاج کی جھلک نظر آئی' جنہوں نے اپنے بیٹوں اور شاگردوں کی عمر کے ایک نوجوان کو جو مستند عالم دین بھی نہ تھا ——— اور وضع قطع سے بھی کوئی مذہبی شخصیت نظر نہ آتا تھا' جس طرح اپنی آنکھوں پر بٹھایا تھا وہ ان کے معتقدین ومتوسلین کی ایک عظیم اکثریت کو آج بھی ناپسند ہے! ——— بہرحال اس ضمن میں کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ راقم مولانا اکبرآبادی کے ان الفاظ کو صرف دلجوئی اور حوصلہ افزائی پر محمول کرتا ہے ——— اور اپنے بارے میں خود اس کا خیال اوّل و آخر یہی ہے کہ وہ قرآن حکیم کے علم وحکمت کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اللہ کے دین متین کا ایک ادنیٰ خادم ہے ——— اور بس!! ——— اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پوری اُمید ہے کہ اس کے سوا کوئی اور ''دعویٰ'' یا ''ادّعا'' نہ اس کے دل میں آئے گا نہ زبان پر!!

محاضرات کے ''بالفعل'' اور ''حاضر'' شرکاء میں سے نو حضرات نے راقم کے دینی فکر اور تصورِ فرائض دینی کی واشگاف اور زوردار یا نسبتاً دبے اور دھیمے الفاظ میں تصویب وتائید فرمائی۔ پانچ حضرات نے بنیادی اور واضح طور پر اختلاف کیا اور سات حضرات کچھ بین بین رہے۔ یعنی انہوں نے بعض پہلوؤں کی تصویب وتحسین فرمائی اور بعض کے ضمن میں کچھ احتیاطوں کا مشورہ دیا۔ راقم کا ظن غالب ہے کہ راقم کی ان پہلی تصریحات کے بعد جو اوپر

وضاحت کے ساتھ درج ہو چکی ہیں' یہ حضرات بھی مؤیدین ہی کی فہرست میں شامل ہوں گے۔

قسم اوّل میں سرفہرست ہیں مولانا مفتی سیاح الدین کا کاخیل' جن کا تعلق اصلاً حلقۂ دیوبند سے ہے۔ ثانوی طور پر ان کا شمار جماعت اسلامی کے ہم خیالوں اور ہم دردوں بلکہ سرپرستوں میں ہوتا ہے' ایک طویل عرصہ تک ریاست پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے رُکن رہے ہیں اور فی الوقت اسلامی یونیورسٹی' اسلام آباد کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس میں کام کر رہے ہیں ——— دوسرے نمبر پر ہیں مولانا سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری جو مفتی صاحب ہی کی طرح اصلاً حلقۂ دیوبند ہی سے تعلق رکھتے ہیں' لیکن سماعِ موتی اور حیات النبی ﷺ کے مسئلے میں ایک جداگانہ رائے کے حامل ہونے کی بنا پر جداگانہ تشخص رکھتے ہیں اور ''جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ'' کے امیر اور سربراہ ہیں۔ تیسری اہم شخصیت ہیں مولانا سید مظفر حسین ندوی جو ندوہ میں اپنے زمانۂ تعلیم کے دوران مولانا سید مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ دونوں کے یکساں منظورِ نظر شاگرد تھے۔ ۴۸۔۱۹۴۷ء کے جہاد کشمیر میں عملاً حصہ لینے والوں بلکہ اس کا آغاز کرنے والوں میں سے تھے ——— اور ایک طویل عرصہ تک حکومتِ آزاد کشمیر کے دینی تعلیم و تربیت کے شعبوں میں خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ چوتھی اہم شخصیت ہے ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب کی جو اصلاً تو شرق پور کے نقشبندی خانوادے سے منسلک ہیں' تاہم عرفِ عام میں بریلوی حلقوں سے زیادہ ربط و ضبط رکھتے ہیں اور فی الوقت پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ معارف اسلامیہ میں تدریس کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ پانچویں واضح مؤید ہیں مولانا قاری سعید الرحمٰن علوی جو ایک عرصہ تک ہفت روزہ ''خدام الدین'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اور آج کل جامع مسجد' شاہ جمال' لاہور میں خطیب کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ بقیہ چار حضرات میں سے دو کراچی کے معروف اہل حدیث علماء و خطباء ہیں یعنی مولانا عبدالوکیل خطیب اور مولانا محمد اسحٰق روپڑی اور دو ہمارے حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے مہمان تھے۔ یعنی مولانا قاری محمد عبدالعلیم اور میر قطب الدین علی چشتی ———!!

اقامتِ دین کی فرضیت' التزامِ جماعت اور بیعت ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ' سمع و طاعت فی المعروف کے لزوم کے تصورات سے مجموعی اور اساسی اختلاف کا اظہار کرنے والوں میں سرفہرست تھے مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ اور مولانا وحید الدین خاں (از دہلی) ——— ان

کے بارے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ماضی میں ان دونوں حضرات کا طویل اور فعال تعلق رہا ہے جماعت اسلامی سے۔ چنانچہ مولانا عبدالغفار حسن کا شمار جماعت اسلامی پاکستان کی صف اوّل کے رہنماؤں میں ہوتا تھا اور مولانا وحید الدین خان جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ عجیب بات ہے کہ تیسری حد درجہ تیز و تند اور اختلافی ہی نہیں ''مخالفانہ'' تقریر تھی ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی جو پنجاب یونیورسٹی میں جمعیت طلبہ کے سرپرست شمار ہوتے ہیں۔ کچھ اسی انداز کی لیکن غیر واضح تقریر تھی حافظ نذر احمد صاحب کی۔ البتہ اسی فکر کی حامل لیکن حد درجہ دھیمی اور مؤثر تقریر تھی مولانا محمد مالک کاندھلوی مدظلہٗ کی۔ اگرچہ اس میں دلیل و استدلال سے زیادہ تلقین و نصیحت اور جذباتی اپیل کا رنگ تھا ——— واللہ اعلم!!

تیسری فہرست میں نمایاں ترین نام ہیں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی' مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی اور مولانا سید محمد متین ہاشمی کے' پھر نمبر آتا ہے' پروفیسر احمد یار' مولانا الطاف الرحمٰن بنوی' حافظ عبدالرحمٰن مدنی' مولانا عبدالحکیم سیف اور مولانا شبیر احمد نورانی کا۔ ان حضرات کے بارے میں راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ ان شاء اللہ راقم کی پیش نظر تحریر میں وارد تصریحات کے بعد ظن غالب یہی ہے کہ انہیں کوئی اختلاف نہیں رہے گا۔

جن پچیس حضرات نے ''محاضرات'' کے لیے تفصیلی تحریریں ارسال فرمائیں یا محض خطوط تحریر فرمائے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) مولانا محی الدین لکھوی نے بھرپور تائید کی اور کلی اتفاق کا اظہار فرمایا۔ مولانا پنجاب کے ایک نہایت مشہور اہل حدیث خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دادا حافظ محمد لکھویؒ نے پنجاب میں ترویج توحید اور ردِّ بدعات کے ضمن میں نہایت مجاہدانہ کردار ادا فرمایا تھا اور پنجابی میں منظوم تفسیر قرآن لکھی تھی۔ ان کے والد مولانا محمد علی لکھوی سے راقم کی ملاقات مدینہ منورہ میں ۱۹۷۰ء میں مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ کے مکان پر ہوئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی اس وقت جمعیت اہل حدیث کے امیر اور پاکستان کی موجودہ نیشنل اسمبلی کے رکن ہیں ——— مولانا خود کبھی جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے لیکن جلد ہی بددل ہو کر علیحدہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں جو پہلا الیکشن پنجاب کی صوبائی اسمبلی کا ہوا تھا مولانا اس کے لیے اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنیاد پر منتخب ہوئے تھے لیکن بعد میں جماعت اسلامی نے انہیں ''adopt'' کر لیا تھا۔ چنانچہ کئی سال تک وہ پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں جماعت اسلامی کے ''اکلوتے'' نمائندے کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ مولانا ان معدودے چند لوگوں

قائدین جماعت اسلامی۔

(۸) پانچ حضرات نے تفصیلی اختلافی نوٹ ارسال فرمائے۔ یہ ہیں (i) مولانا محمد طاسین صاحب، مدیر مجلس علمی، کراچی (ii) مولانا محمد ازہر، مدیر ماہنامہ ''الخیر'' ملتان (iii) پروفیسر طاہر القادری، لاہور (vi) جناب جاوید احمد، لاہور ——— اور (v) جناب عبدالمجیب، کراچی ——— ان میں سے مؤخرالذکر دو حضرات میں متعدد امور مشترک ہیں: ایک یہ کہ دونوں نے از خود ''کرم فرمائی'' کی ہے۔ وہ ہمارے مدعوئین میں شامل نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ دونوں جماعت اسلامی کے ''سابقین'' کے زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ دونوں کا موقف وہی ہے جو مولانا عبدالغفار حسن اور مولانا وحیدالدین خان کا ہے!

(۹) تین حضرات نے راقم اور اس کی مساعی سے شدید اظہارِ بیزاری اور اعلانِ براءت فرماتے ہوئے شرکت سے ''انکار'' فرمایا۔ یہ ہیں (i) جماعت اسلامی کے حلقے کے مشہور ادیب اور دانشور جناب نعیم صدیقی (ii) ماہنامہ ''بینات'' کراچی کے مدیر مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور (iii) مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے خطیب مولانا محمد عبداللہ صاحب۔

(۱۰) از خود ''کرم'' فرمانے والوں میں ایک اور صاحب محمد عبداللہ، لاہور، ہیں جنہوں نے ایک تحریر عنایت فرمائی جو نصف تائید و تحسین اور نصف تنقید و اختلاف پر مشتمل ہے۔

راقم ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکریہ پہلے بھی ادا کر چکا ہے۔ آخر میں دوبارہ ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ انہیں اس تعاون کا بھرپور صلہ عطا فرمائے۔

یہ فہرست نامکمل رہ جائے گی اور حق تلفی بھی ہوگی اگر راقم ڈاکٹر غلام محمد مدظلہٗ خلیفۂ مجاز مولانا سید سلیمان ندویؒ کا شکریہ ادا نہ کرے کہ وہ اپنی شدید مجبوری کے باعث محاضرات میں شرکت سے معذرت پیش فرمانے کے لیے خود چل کر قرآن اکیڈمی تشریف لائے (اس لیے کہ چند روز قبل پنجاب یونیورسٹی کے کسی امتحان کے ضمن میں ان کی لاہور تشریف آوری ہوئی تھی لیکن بعض اسباب سے فوری واپسی لازمی تھی!) دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاقِ عالیہ و کریمانہ کا کوئی ادنیٰ عکس راقم کو بھی عطا فرما دے۔

''محاضرات'' کی بات لمبی ہوگئی۔ معذرت خواہ ہوں ———ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!!

(۲) مکتوب گرامی مولانا گوہر رحمٰن، مردان

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
صدر مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ تو مل چکا ہے، لیکن انہی ایام میں قومی اسمبلی کے اجلاس ہو رہے ہیں۔ اس لیے شرکت سے معذور ہوں۔

آپ اور آپ کی انجمن نے اصلاح معاشرہ کے لیے ''جہاد بالقرآن'' کا جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے میں اس کی تحسین کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العالمین اس جدوجہد میں برکت ڈالے اور کامیابی عطا فرمائے۔

خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے اصلاحی اور انقلابی کام کا آغاز قرآن پڑھنے اور پڑھانے سے ہوا تھا اور آخر دم تک یہی قرآن آپ کا حقیقی اسلحہ رہا ہے۔ ہر قسم کی اعتقادی اور عملی و اخلاقی برائیوں اور بیماریوں کا علاج صرف قرآن کریم اور سنت رسولؐ ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ قرآن پر ظلم کی کئی قسمیں ہیں۔ قرآن کی تلاوت اور اس کے علوم سے غفلت اختیار کرنا بھی ظلم ہے، اس پر عمل نہ کرنا بھی ظلم ہے اور قرآن وسنت کے خلاف دوسرے قوانین پر فیصلے کرنا بھی ظلم ہے۔ جو لوگ قرآن کریم کی تعلیمات سے غافل ہو جاتے ہیں ان پر شیطان کو مسلط کر دیا جاتا ہے: ﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴾۔ ہر دور کے مجددین و مصلحین نے اپنے تجدیدی اور اصلاحی جدوجہد کا آغاز قرآن کی تعلیمات کی اشاعت سے کیا ہے۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی تجدیدی و اصلاحی تحریک کا آغاز بھی قرآن کریم کے فارسی ترجمے سے ہوا تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریک اقامت دین کا آغاز بھی ترجمان القرآن میں قرآنی تعلیمات کی اشاعت سے ہوا تھا۔ شیخ حسن البناء شہید کی تحریک کا آغاز بھی قرآن کریم کے درسوں ہی سے ہوا تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو بھی مفید تر بنائے۔ والسلام

گوہر رحمان
شیخ الحدیث دارالعلوم تفہیم القرآن، مردان (رکن قومی اسمبلی)

ضمیمہ

(۱) مکتوب گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ

محبّ گرامی منزلت ڈاکٹر صاحب زید توفیقہ ومکارمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ ۱۴/مارچ جلد پہنچ گیا۔ آپ کی کریم النفسی اور وسیع القلبی پر مسرت ہوئی۔ یہاں کی بعض اہم مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کی بنا پر ریاض کی کانفرنس میں شرکت سے جو ۲۷/مارچ کو ہونے والی تھی، میں نے معذرت کا تار دے دیا، اس سے زیادہ اہم کام حیدرآباد اور کلکتے میں پیش آ گئے۔ اب واپسی پر بھی پاکستان آنے کا مسئلہ نہیں رہا۔ اس کے لیے کسی دوسرے موزوں وقت اور مناسب سفر کا انتظار کرنا پڑے گا۔

سفر پاکستان کے سلسلے میں دو باتیں بے تکلف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اُمید ہے کہ آپ ان کو ان کی صحیح اسپرٹ پر لیں گے کہ ایک یہ کہ.....

دوسری بات یہ کہ (آپ سے بے تکلف کہتا ہوں کہ) میں وہاں کسی تنظیم وتحریک کی دعوت پر آنے کے بجائے آزادانہ طریقے پر حاضری کو ترجیح دیتا ہوں تاکہ بے ہمہ و باہمہ رہوں۔ یہ طویل تجربوں اور دعوتی مصلحتوں پر مبنی ہے، جب ان شاء اللہ آؤں گا اور آپ مناسب سمجھیں گے اور وقت مناسب ہوگا تو آپ مجھے اپنے یہاں دعوت دے سکتے ہیں اور میرے کسی خطبے یا خطبات کا انتظام کر سکتے ہیں۔ مولانا عبدالمالک کو میں نے ایسا ہی اشارہ دیا ہے جنہوں نے مجھے حجاز میں دعوت پیش کی تھی اور یاد دہانی کا خط بھی آیا۔ اس کا تعلق کسی ناگواری یا بدگمانی سے نہیں۔ آپ کی صلاحیتوں، قوتِ عمل اور جدوجہد کی قدر کرتا ہوں اور اپنے جیسے قاصر الہمت اور ضعیف انسان پر ترجیح دیتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری اس معذوری یا نزاکت کو اس کی صحیح جگہ دیں گے۔

جب بھی پاکستان آیا (تو ان شاء اللہ اگر کوئی شدید مانع پیش نہ آیا تو) لاہور آؤں گا اور آپ کو بھی وقت دوں گا اور اپنے مطالعے وتجربے کے مطابق اخلاص کے ساتھ آپ کے رفقاء و طالبین علوم قرآن کو مشورہ بھی دوں گا۔ خدا کرے یہ خط کسی گرانی و بدگمانی کا باعث نہ ہو۔

والسلام

مخلص ابوالحسن علی

خطابِ جمعہ

مسجد دارالسلام لاہور‘ ۲۹/ مارچ ۱۹۸۵ء

- پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی یاد میں جلسہ
- سالانہ محاضراتِ قرآنی کی شاندار کامیابی پر اللہ کا شکر
- نصرتِ خداوندی کے حصول کا یقینی طریقہ: نصرتِ خدا اور رسولؐ

یعنی غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد

مولانا سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد) کی تقریر کے حوالے سے!

مرتبہ: شیخ جمیل الرحمٰن

(’تذکرہ و تبصرہ‘ ماہنامہ ’میثاق‘ بابت مئی ۱۹۸۵ء)

(۳) مکتوب گرامی مولانا محی الدین لکھوی

من محی الدین اللکھوی، الی الاخ المحترم دکتور اسرار احمد، لاھور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امابعد: فرمانِ نبویؐ ہے:

((تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ، لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا، کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ))

معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کے بارے میں آپ نے حق تلاوت ادا کیا ہے، لیکن سنت رسول ﷺ سے آپ نے استغنا رکھا ہے اور بزرگانِ دین سے زیادہ متاثر رہے ہیں۔ ورنہ اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت ہو جانے کے بعد آپ کو اس قدر تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ اگرچہ آپ کی کاوش قابل داد ہے اور آپ کا ''تصور فرائض دینی'' مستحسن ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ اہل ایمان کے لیے یہ بھی ایک فریضہ ہے کہ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ اور اس آیۂ مبارکہ پر عمل کی صرف ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ

((اِنِّیْ آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ))

اس وقت جو انارکی اور انتشار پھیل چکا ہے اس کی وجہ سے ہم موجودہ دور کو شر القرون کہیں تو غلط نہیں اور میرا اس حدیث شریف پر پورا یقین ہے کہ:

((مَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً))

آپ ''تنظیم اسلامی'' کے نام پر بیعت لیتے رہیں۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ کی رو سے یہ صحیح ہے۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ عالمی سطح پر یہ تحریک چلائیں اور عوام وخواص کو دعوت دیں، تاکہ دینی جماعتیں مل کر عالمی سطح پر یا ایک امیر کا انتخاب کریں اور پورے عالم اسلام میں اتحاد پیدا ہو جائے، یا کم از کم عالمی سطح پر ایک متحد اسلامی جمعیت معرضِ وجود میں آ جائے۔

بہر حال میں نظامِ امارت میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مژدہ سناتا ہوں کہ ''مَنْ تَمَسَّکَ بِسُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَہٗ اَجْرُ مِائَۃِ شَھِیْدٍ''

والسلام محی الدین

الہ آباد المعروف قلعہ تارے والا، ڈاک خانہ خاص،

براستہ دیپالپور، ضلع اوکاڑہ

(نوٹ) میں بوجوہ ''محاضرات'' میں حاضری نہیں دے سکا، لیکن احیاءِ نظامِ امارت میں آپ کے ساتھ ہوں۔ جب بھی ممکن ہوا ملاقات کے لیے حاضر ہوں گا۔ ان شاء اللہ!

لائیں اور رہنمائی فرمائیں کہ اس تصورِ دینی میں کیا صواب ہے اور کیا خطا یا تقصیر ہے! ان مدعوین میں سے پچیس تیس کے مابین حضرات تشریف لائے۔ان میں ہمارے ملک کے چوٹی کے علماء بھی شامل ہیں۔حضرت مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہ گجرات والے جو ایک خاص مکتبہ فکر اور مسلک کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں (۱) ۔حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی (۲) شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نہ صرف یہ کہ ملک گیر شہرت کے حامل ہیں بلکہ وہ ضیاء صاحب کی نامزد کردہ مجلس شوریٰ کے بھی رکن رہے ہیں اور اس اعتبار سے بھی نمایاں ہوئے ہیں۔مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل مدظلہٗ جو اسلامی نظریاتی کونسل کے قریباً مستقل رکن رہے ہیں اور بہت معروف شخصیت ہیں۔ان کا زیادہ تر اتفاق،تعاون اور اشتراکِ عمل جماعت اسلامی کے ساتھ ہے (۳) ۔مولانا مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہٗ بریلوی مکتب فکر کی ایک نمایاں شخصیت ہیں (۴) ۔وہ بھی مجلس شوریٰ کے کافی عرصہ رکن رہے ہیں۔ویسے تو موصوف ملک کی سطح پر معروف ہیں لیکن لاہور کی تو بہرحال وہ ایک نمایاں شخصیت ہیں۔مولانا عبدالغفار حسن صاحب مدظلہٗ اصلاً اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والی ایک معروف شخصیت ہیں۔انہوں نے جماعت اسلامی میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے اور ۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک کے سلسلہ میں جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ومغفور اسیر رہے تھے تو کچھ عرصہ مولانا موصوف جماعت اسلامی کے امیر بھی رہے ہیں۔پھر وہ اسی زمانہ یعنی ۱۹۵۷ء میں علیحدہ ہوئے تھے جس زمانہ میں چند دوسرے حضرات اور میں خود علیحدہ ہوا تھا۔پھر مولانا نے طویل عرصہ تک تدریس حدیث کی ذمہ داری جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ادا کی ہے۔مزید یہ کہ وہ بھی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے ہیں اور شوریٰ کے بھی (۵) ——— پھر مولانا عبدالقادر

---

(۱) شاہ صاحب قبلہ نے پورے خاکہ کی تصویب وتوثیق فرمائی۔(مرتب)

(۲) مولانا موصوف مدظلہٗ نے جماعت سازی میں اندیشوں کا اظہار فرمایا۔(مرتب)

(۳) مفتی صاحب قبلہ نے بیعت کے مسئلہ کے سوا پورے خاکہ سے اتفاق فرمایا۔بیعت کے مسئلہ پر گفتگو کسی آئندہ موقع کے لیے ملتوی فرمادی۔(مرتب)

(۴) مفتی صاحب موصوف نے ''قرآن کے تصور فرائض دینی'' کے جزو اوّل و دوم سے اور جماعت کے التزام سے کامل اتفاق فرمایا لیکن بیعت اور جہاد بالسیف کو چند اہم شرائط سے مشروط قرار دیا۔(مرتب)

(۵) مولانا موصوف مدظلہ نے ہر نوع کی دینی جماعت بنانے سے بھرپور اختلاف کیا۔(مرتب)

خطبہ مسنونہ اور دعا کے بعد:

حضرات! آپ میں سے اکثر کو اس کا اندازہ ہے کہ ۲۲/ مارچ سے کل ۲۸/ مارچ تک پورا ہفتہ میرا اور میرے ساتھی یعنی تنظیم اسلامی کے رفقاء اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے جو فعال وابستگان ہیں' ان کا وقت شدید مصروفیت اور مشقت میں گزرا ہے۔ ۲۲/ مارچ کے جمعہ کی تقریر' خطبہ اور نماز ہوئی۔ پھر اسی شام کو مغرب کے بعد ہم نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ وہ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ جلسہ کے صدر جناب چیف جسٹس (ریٹائرڈ) شیخ انوار الحق صاحب تھے۔ موصوف اپنی ایک دوسری مصروفیت کی وجہ سے دورانِ جلسہ اجازت لے کر چلے گئے تھے۔ بعدہ جلسہ جناب علامہ شبیر احمد بخاری سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی صدارت میں جاری رہا۔ مقررین نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کی اور سامعین نے بھی ہمیں مایوس نہیں کیا۔ بلکہ واقعتاً ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر اس اجلاس میں شرکاء کی تعداد تھی —— پھر ہفتہ کی صبح کو ہماری مرکزی انجمن خدام القرآن کا ایک فنکشن تھا۔ وہ بھی صبح نو بجے سے شروع ہو کر ایک بجے دوپہر کو ختم ہوا۔ پھر اسی شام سے محاضراتِ قرآنی کا قرآن اکیڈمی میں سلسلہ شروع ہو گیا جو جمعرات ۲۸/ مارچ کی شب تک چلتا رہا اور ہر اجلاس عموماً رات کو ۱۰ بجے تک جاری رہتا تھا۔ پھر اتوار کی صبح سے تنظیم اسلامی کے دس سالہ اجتماع کا آغاز ہوا جو کل ۲۸/ تاریخ کو ظہر کے وقت اختتام پذیر ہوا۔ اس طرح روزانہ صبح آٹھ بجے سے لے کر ایک بجے تک اور شام کو عصر سے لے کر رات دس بجے تک ہماری شدید ترین مصروفیت رہی ہے۔

محاضراتِ قرآنی کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے اور میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعہ میں اللہ سبحانہٗ کا شکر ادا کر سکوں۔ ان محاضرات کو جو گوناگوں کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ ہماری ہر توقع سے بڑھ کر ہے۔ ہم نے قریباً اسّی اہل علم وفضل حضرات کو ان محاضرات میں شرکت کی دعوت دی تھی کہ وہ ان محاضرات کے موضوع ''قرآن کا تصور فرائض دینی'' پر اظہار خیال فرمائیں —— میں نے قرآن حکیم' سنت وسیرتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعہ سے فرائض دینی کا جو جامع تصور اخذ کیا ہے جس کے پیش نظر عملی جدوجہد کے لیے میں قریباً بیس سال سے ہمہ تن لگا ہوا ہوں' اس کا خلاصہ بھی ان حضرات کی خدمت میں ارسال کر دیا تھا اور ان سے استدعا کی تھی کہ علماء کرام اور اصحابِ دانش تشریف

میں سے ہیں جن میں اہلحدیثیت کی سختی اور درشتی کے ساتھ ساتھ تصوف کی مٹھاس اور چاشنی بھی موجود ہوتی ہے ——— (اس کی ایک نادِر روزگار مثال امرتسر اور لاہور کا خانوادۂ غزنویہ ہے) مولانا اپنا بعض ''تفردات'' کے باعث کچھ عرصہ سے الگ تھلگ زندگی گزار رہے ہیں لیکن اب اُمید ہے کہ یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔ اللّٰھُمَّ آمِیْن!! ——— مولانا موصوف کا خط اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(۲) مولانا گوہر رحمٰن صاحب رکن جماعت اسلامی، شیخ الحدیث دارالعلوم تفہیم القرآن مردان اور رکن قومی اسمبلی نے بھی نہایت حوصلہ افزا اور تحسین آمیز خط تحریر فرمایا۔ ان کا خط بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

(۳) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ——— جو اس وقت بلاشبہ پورے عالم اسلام کی چوٹی کی دینی شخصیتوں میں سے ہیں ——— اگرچہ محاضرات کے نفس موضوع پر تو نہ کچھ تائیداً فرمایا نہ تنقیداً۔ البتہ راقم الحروف کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے جو الفاظ تحریر فرمائے وہ خود ان کی عظمت کے تو شاہد عادل ہیں ہی راقم کے لیے تا زیست سرمایۂ افتخار رہیں گے۔ ان کا خط بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

(۴) پانچ حضرات نے مصروفیت کی بنا پر شرکت سے معذرت کرتے ہوئے راقم اور اس کی مساعی کے لیے نیک خیالات و جذبات کا اظہار فرمایا اور دعائے خیر سے نوازا۔ راقم کو ایک گونہ فخر ہے اس پر کہ اس فہرست میں حضرت مولانا خان محمد صاحب، سجادہ نشین، خانقاہ سراجیہ، کندیاں شریف، مولانا نور الحق صاحب ندوی و ازہری (پشاور)، مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)، مولانا محمد اسحاق صدیقی (کراچی) اور مولانا سمیع الحق (اکوڑہ خٹک) ایسے حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

(۵) تین حضرات نے شرکت کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ لیکن بعد میں کسی سبب سے تشریف نہ لا سکے، یہ ہیں مولانا عبدالقیوم حقانی (اکوڑہ خٹک)، مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور، انڈیا) اور قاضی شمس الدین صاحب گوجرانوالہ۔

(۶) تین حضرات کی جانب سے محض معذرت موصول ہوئی بلا کسی تائید یا تنقید کے یعنی شاہ بدیع الدین صاحب پیر آف جھنڈا (سندھ)، جناب شمس پیرزادہ (بمبئی) اور حافظ احسان الٰہی ظہیر (لاہور)

(۷) دو حضرات نے مختصر معذرت اور اجمالی اظہارِ اختلاف پر مشتمل خطوط تحریر فرمائے۔ ایک مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ مدیر ''الفرقان'' (لکھنؤ) اور دوسرے سید اسعد گیلانی یکے از مرکزی

صاحب روپڑی [1] مدظلہٗ اہل حدیث علماء میں چوٹی کی شخصیتوں میں سے ہیں —— یہ سب شریک ہوئے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ شرکت کرنے والے جن حضرات کے نام میں نے آپ کو بتائے ہیں یہ اپنے اپنے حلقوں کی چوٹی کی شخصیتیں ہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ حضرات کرام اپنے اپنے حلقہ کی چوٹی کی شخصیتوں میں سے ضرور ہیں۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ان کے علاوہ بھی اپنے اپنے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے پاکستان کے بہت سے علماء نے شرکت فرمائی۔

ہندوستان سے مولانا وحید الدین خاں صاحب [2] مدظلہٗ دہلی سے تشریف لائے۔ بہت معروف شخصیت ہیں۔ آپ نے شاید نام سنا ہو۔ ان کو سیرت پر لکھی ہوئی ایک کتاب پر پچھلے سال ایک بڑا انعام ملا تھا۔ ہمارے صدر ضیاء الحق ہر سال سیرت پر جو فنکشن منعقد کرتے ہیں، اس میں کتابوں پر انعام ملتے ہیں تو یہ عالمی سطح پر مقابلہ ہوتا ہے۔ اس میں انہیں انعام ملا تھا۔ طویل عرصہ سے ان کی زیر ادارت دہلی سے ماہنامہ ''الرسالہ'' نکلتا ہے جو دینی اور علمی حلقوں میں بہت معروف ہے —— حیدرآباد دکن سے دو علمی شخصیتیں تشریف لائیں۔ ان میں سے ایک صاحب تو آل انڈیا سطح پر ایک منصب کے حامل ہیں۔ قراء حضرات کی ایک آل انڈیا تنظیم ہے، اس کے وہ اعزازی معتمد اعلیٰ (سیکرٹری جنرل) ہیں۔ وہ ہیں حضرت مولانا قاری عبدالعلیم صاحب مدظلہٗ۔ وہ اس جمعہ میں بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ میں اپنی تقریر کے بعد ان سے مختصر خطاب نیز خطبۂ جمعہ ارشاد فرمانے اور صلوٰۃ جمعہ کی امامت کرنے کی درخواست کروں گا۔ دوسرے صاحب مولانا قاری قطب الدین علی چشتی مدظلہٗ ہیں جو حیدرآباد دکن کی ایک معروف علمی ودینی شخصیت ہیں۔ یہ دونوں حضرات کل ہی لاہور پہنچے ہیں [3]۔ حیدرآباد دکن سے تو یہ قریباً پونے دو ہزار میل کا سفر طے کر کے ۱۹/ مارچ ہی کو دہلی پہنچ گئے تھے لیکن پاکستان کا ویزا ملنے میں ان حضرات کو بڑی دشواریوں، دقتوں اور پریشانیوں سے سابقہ پیش آیا۔ بہرحال یہ حضرات کل ۲۸/ مارچ کو لاہور پہنچ گئے اور کل ان حضرات نے محاضرات کو اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرمایا۔

---

(۱) مولانا موصوف مدظلہٗ نے بھی مفتی سیاح الدین کاکاخیل مدظلہ کے مطابق موقف اختیار کیا۔ (مرتب)

(۲) مولانا موصوف مدظلہٗ نے مولانا عبدالغفار حسن کے موقف کی تائید کی۔ (مرتب)

(۳) ان دونوں حضرات نے بھی ڈاکٹر صاحب کے موقف کی مکمل تائید فرمائی۔ (مرتب)

ان محاضرات میں جن پچیس تیس علماء اور اہل علم وفضل حضرات نے اظہارِ خیال فرمایا ان میں سے چند حضرات کے نام میں نے پیش کیے ہیں۔ میرے لیے بڑا مشکل مسئلہ ہے کہ ان میں سے اور دوسرے حضرات میں سے کس کو صفِ اوّل کی شخصیتیں کہا جائے اور کن کو صف دوم کی شخصیتیں قرار دیا جائے۔ بہرحال میں اپنی معلومات اور ان حضرات کی اکثریت کو معروف ہونے کے اعتبار سے صفِ اوّل کی شخصیات قرار دے رہا ہوں —— ان حضرات کی تشریف آوری اور اشتراک وتعاون کے اعتبار سے میرے نزدیک بہت بڑی کامیابی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کا کوئی نمایاں مکتبِ فکر ایسا نہیں ہے جس کے چوٹی کے علماء میں سے کوئی نہ کوئی شریک نہ ہوا ہو۔ پھر یہ کہ ان محاضرات میں جو سنجیدہ و باوقار فضا برقرار رہی وہ نہایت ہی خوش آئند، لائق تحسین اور قابل داد ہے۔ بعض مقررین نے بعض اعتبارات سے میری چند آراء سے کھل کر شدید اختلاف کیا ان پر شدید تنقیدیں کیں۔ اب میری انجمن اور میری تنظیم کا جلسہ ہے، میری ہی صدارت میں محاضرات کی تمام نشستیں منعقد ہو رہی ہیں، شرکاء کی عظیم ترین اکثریت بھی میرے فکر سے اتفاق رکھنے والے اور میرے کاموں میں دامے درمے سخنے تعاون کرنے والوں پر مشتمل رہی ہے، لیکن سب نے ان اختلافات اور تنقیدوں کو بڑے صبر، سکون اور تحمل سے سنا —— اسی لیے تو میں نے ان محاضرات کا موضوع ''قرآن کا تصور فرائض دینی'' رکھا تھا تاکہ دوسرے اہل علم وفضل کے تائیدی اور اختلافی آراء اور ان کے دلائل ہم سب کے سامنے آجائیں اور اگر واقعی ہم پر ہماری کوئی غلطی واضح ہو جائے تو اس کی اصلاح کی جا سکے۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ بعض حضرات کی طرف سے اختلافی آراء آئیں گی اور تنقیدیں ہوں گی۔ اس موقع پر یہ انتقال ذہنی ہے کہ مجھے فوراً یاد آیا کہ قرآن مجید میں سورۂ ہود کی آیت ۱۱۸ کے آخر میں فرمایا: ﴿وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ۝﴾ اور اگلی آیت کے درمیان میں فرمایا: ﴿وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ﴾ ''لوگ اختلاف تو کرتے ہی رہیں گے'' —— اور اسی لیے تو اللہ نے ان کو پیدا فرمایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس حکمت پر تخلیق فرمائی ہے کہ اس میں اختلاف ہے۔ شکلوں کا اختلاف ہے، رنگوں کا اختلاف ہے، زبانوں کا اختلاف ہے، مزاج کا اختلاف ہے، اندازِ فکر کا اختلاف ہے، آراء کا اختلاف ہے، تعبیر واستنباط کا اختلاف ہے۔ ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' والا معاملہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی اختلاف تھا۔ کسی کا مزاج کچھ ہے، کسی کا دوسرا مزاج ہے۔ کوئی بالکل درویش منش ہے، کوئی کاروباری صلاحیت بہت رکھتا ہے۔ کوئی مردِ میدان بہت زیادہ ہے، بڑا شجاع، دلیر اور بہادر ہے۔ کوئی اعلیٰ پائے کا

خطیب ہے۔ کسی کو ہم کہتے ہیں کہ وہ فقہائے صحابہؓ میں سے ہیں۔ ان کو دین و شریعت کا خصوصی فہم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ وہؓ قانون و قضا میں دور رس نگاہ رکھتے ہیں۔ کسی کو قراءت قرآنِ مجید سے بہت زیادہ شغف ہے۔ کسی پر زہد کا انتہائی غلبہ ہے۔ کوئی تدبر' فراست میں یکتائے زمانہ ہے' انتظامی صلاحیتیں ان میں بے انتہا ہیں۔ تو ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کا معاملہ تھا۔ ﴿وَلِذٰلِکَ خَلَقَھُمْ﴾۔ اللہ نے بنایا ہی ایسا ہے۔ یہ گونا گونی' یہ بوقلمونی' یہ رنگا رنگی نہ ہو تو یہاں بڑی یکسانیت پیدا ہو جائے جس سے طبیعت اُکتا جائے۔ پھر یہ کہ اختلاف رائے سے اصلاح کی راہیں کھلتی ہیں۔ اخلاص و خلوص موجود ہو' ہٹ دھرمی اور ضد و انانیت نہ ہو تو اختلاف رحمت ثابت ہوتا ہے۔ معاملہ وہی ہے جو اس مصرع میں سامنے آتا ہے ع

اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!

تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے محاضرات میں یہ موضوع رکھا ہی اس لیے تھا کہ ہمارے اہل علم و فضل کی آراء سامنے آ جائیں تا کہ ان کی روشنی میں ہم اپنے فکر' اپنی دعوت' اپنے کام اور اپنی جدوجہد کے ہدف پر غور و فکر کر سکیں اور جو صحیح بات بھی دلائل کے ساتھ سامنے آئے' اسے قبول کر کے اصلاح کر سکیں۔ لہٰذا اختلافات سامنے آئے اور کھل کر سامنے آئے' لیکن قابل شکر بات یہ ہے کہ کوئی تلخی نہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے تاکیداً یہ کہہ دیا تھا کہ بالکل سامع بن کر بیٹھیں اور اختلافات و تنقیدات کو کھلے کانوں اور کھلے دماغوں سے سنیں' البتہ استفہام کے لیے کوئی سوال کرنا ہو تو اسے تحریری طور پر کر لیں۔ کوئی جرح' کوئی تنقید اور ان کو اپنی بات پڑھانے کی کوشش' اپنی بات منوانے کی سعی' ان باتوں سے میں نے سختی سے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا تھا۔ سامعین میں صرف ہماری انجمن اور تنظیم کے رفقاء ہی نہیں تھے۔ دوسرے حضرات بھی تھے۔ بہرحال کسی نے اس نوع کے سوالات بھیجے بھی تو میں نے ان کو روک لیا۔ استفہامی نوعیت کے سوالوں میں سے بھی وقت کی کمی کی وجہ سے چند ہی سوالات متعلقہ مقرر کی خدمت میں پیش کیے گئے۔

جو اہل علم و فضل حضرات ان محاضرات میں تشریف لائے ان میں سے متعدد حضرات نے علیٰ رؤس الاشہاد اس بات کا اعتراف کیا کہ برصغیر پاک و ہند کی جہاں تک معلوم تاریخ ہے اس میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس نوع کی ایک مجلس ترتیب دی گئی اور اہل علم و فضل کو دعوت دی گئی کہ آیئے مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہماری غلطیاں بتایئے۔ ہم سمجھنا چاہتے ہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہم پر دین کے جو فرائض اور تقاضے عاید ہوتے ہیں ہم ان کو جاننا

چاہتے ہیں اور ان کو ادا کرنے کے لیے کمر بستہ ہوئے ہیں۔ ہمیں کوئی شوقِ مجلس آرائی اور انجمن آرائی اور کوئی شوقِ سیادت و قیادت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے ہمیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور ان سے بچائے —— اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ نہایت خوشگوار ماحول میں یہ چھ دن کے مسلسل محاضرات ہوئے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی کسی طور پر بھی مناظرے کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی —— میں نے تو پہلے ہی طے کر کے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گفتگو میں محض سامع بنا رہوں گا اور کسی اختلاف اور کسی رائے پر بھی اظہارِ خیال نہیں کروں گا۔ استفہامی سوال کے لیے میں نے اپنا حق رکھا تھا لیکن میں نے اس کو بھی استعمال نہیں کیا۔ البتہ صرف دو ضمنی مختصر سوالات کیے۔ اس سے زیادہ میں نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

البتہ بعض علماء کے متعلق پوری مجلس نے یہ محسوس کیا کہ وہ تیاری کر کے نہیں آئے تھے۔ انہوں نے ایسے نکات پر جن پر کسی کو سرے سے اختلاف ہو ہی نہیں سکتا ایک وعظ کہہ دیا۔ اپنی جگہ درحقیقت وہ مواعظ بھی نہایت قیمتی تھے لیکن جس مقصد کے لیے یہ محاضرات منعقد کیے گئے تھے اس کے اعتبار سے وہ غیر متعلق تھے اور جو اصل نکتہ تھا جس میں اختلاف رائے کی گنجائش تھی اور جس کے متعلق رہنمائی مطلوب تھی، یعنی لزومِ اجتماعیت، اس کے تقاضے، ان کی انجام دہی کے لیے بیعت، ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ و سمع و طاعت فی المعروف پر مبنی خالص دینی جماعت کا قیام —— تو اس پر اظہارِ خیال سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔ نہ ان کی تصویب و توثیق کے متعلق کچھ فرمایا گیا اور نہ ہی اس سے اختلاف کرتے ہوئے کتاب و سنت سے دلائل پیش کیے گئے۔ بایں ہمہ ان مواعظِ حسنہ کو بھی جملہ شرکاء نے صبر و سکون اور توجہ سے سنا۔ میرے لیے یہ بات نہایت ہی اطمینان بخش ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس پر کتنا ہی اللہ کا شکر کروں، شکر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں فللّٰہ الحمد و المنة۔

میری اپنی سوچ اور اپنے فکر کے اعتبار سے ان محاضرات کی اہم ترین بات یہ ہے کہ میں نے محسوس نہیں کیا کہ کسی صاحب کی طرف سے کوئی بڑی بنیادی اختلافی بات محکم دلائل کے ساتھ آئی ہو —— اختلاف کی نوعیت عموماً یہ رہی ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک جماعت یا تنظیم کے قیام سے بہت سے اندیشے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ بعض ضروری احتیاطیں ہونی چاہئیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض حضرات نے میری بعض ان تعبیرات سے شدید اختلاف کیا جن کے متعلق میں گزشتہ جمعہ کی اپنی تقریر میں پیشگی اعتراف کر چکا تھا کہ

رواداری میں کچھ الفاظ ایسے استعمال ہو گئے ہیں کہ جن سے بعض حضرات کو مغالطہ ہوا ہے۔ مثلاً میں نے اس خط میں جو اہل علم و فضل کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ یہ لکھا تھا کہ:

''آخر میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لیے ضرور وقت نکالیں۔ اس لیے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی' خصوصاً جبکہ اُس کا محرک و داعی خود اس کے لیے مستدعی ہو' ایک اہم دینی فریضہ ہے!—— بصورت دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی جناب ہی نے توجہ نہیں فرمائی۔''

میرے خط کی عبارت کے اس حصے میں جو الفاظ آئے ہیں کہ ''آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی'' ان کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ میں اس طرح ان سے اپنی بیعت کرا کے تنظیم اسلامی میں شامل ہونے کی دعوت دے کر ''حجت'' قائم کر رہا ہوں۔ حاشا وکلا میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں اسے اپنی کوتاہ قلمی اور اپنی تقصیر سمجھتا ہوں کہ ان الفاظ سے بعض حضرات نے یہ مفہوم اخذ کیا —— میرا اس عبارت سے مقصود یہ تھا کہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ علماء کرام آسانی سے میری دعوت قبول نہیں کریں گے تو میں نے ایک انتباہ کے طور پر لکھا تھا کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور تشریف لائیں۔ اس مفہوم و معنی میں مَیں نے لفظ حجت استعمال کیا تھا کہ دیکھئے کہ میں نے تو آپ سے ہدایت و رہنمائی چاہی تھی' آپ نے نہیں دی تو اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ جواب دہ ہوں گے۔ ایک تو وہ ہے جسے آپ ہدایت دینا چاہتے ہیں لیکن وہ سرتابی کرتا ہے —— اب دیکھئے وہی انتقالِ ذہنی والا معاملہ ہے۔ میرا ذہن سورۂ عبس کی ان آیات کی طرف منتقل ہوا: ﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی ﴿۸﴾ وَھُوَ یَخْشٰی ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ﴿۱۰﴾﴾ جو شخص چاہتا ہے کہ مجھے بتاؤ' میری جو غلطی ہے اس کی نشاندہی کرو —— اب اس کے باوجود کوئی استغناء کا انداز اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے جواز اور عذر پیش کرنے میں مشکل پیش آ سکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی شرعی عذر کی بنا پر لاہور کا سفر کرنا یا تشریف لانا ممکن نہ ہو۔ توقع ہے کہ جن حضرات کو عبارت کے اس حصہ سے مغالطہ لاحق ہوا ہے ان کی غلط فہمی ان شاء اللہ اس وضاحت سے رفع ہو جائے گی۔ چند دوسری تعبیرات کی میں وضاحت آگے کروں گا —— تین حضرات کے مجھے خطوط آئے ہیں کہ ہم تو تم سے اتنے بیزار ہیں کہ آنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے ایک مزاج ہے' افتاد ہے۔ باقی بعض اکابر علماء جو تشریف نہیں لا سکے ان کے

نہایت عمدہ اور حوصلہ افزا خطوط آئے ہیں۔ ان میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا وہ میرے لیے سرمایۂ زیست رہیں گے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ جو اس وقت برصغیر کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں، میں بلا خوفِ تردید اپنے تجربہ اور علم کے اعتبار سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا موصوف اپنی عمر، اپنے وسیع تجربے اور اپنے علم و فضل کی بنیاد پر واقعتاً اس دور میں چوٹی کے عالم ہیں۔ وہ شخص جو کلکتہ کی قدیم اور معیاری درس گاہ مدرسہ عالیہ کا طویل عرصہ تک پرنسپل رہا ہو۔ وہ شخص جو علی گڑھ یونیورسٹی کا طویل عرصہ تک شعبۂ دینیات کا صدر رہا ہو۔ وہ شخص جو بے شمار نہایت اعلیٰ اور تحقیقی کتابوں کا مصنف ہے۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کی بعض کتابیں پڑھی تھیں جن میں ''حقیقت وحی'' سے میں نے بہت استفادہ کیا تھا۔ آج تک میری لائبریری میں شاید وہ نسخہ موجود ہو جس کے بعض ابواب کو میں نے انڈر لائن کر کے پڑھا تھا جس طرح میں میڈیکل کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ میری یہ عادت تھی کہ ضروری حصوں کو سرخ نیلی اور دوسری رنگوں کی پنسلوں سے انڈر لائن کیا کرتا تھا تاکہ حسب ضرورت ان میں ربط قائم کر سکوں اور جب کبھی موقع آئے تو صرف ایک نگاہ دوڑا کر رنگوں کے اختلاف سے مضمون کے نکات کو باہمی جوڑ کر نتیجہ نکال سکوں —— اسی انداز سے میں نے مولانا موصوف کی کتاب ''حقیقتِ وحی'' کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ وہ شخص اُس وقت اتنے اعلیٰ پائے کا مصنف تھا۔ ابھی سیرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ان کی بڑی محققانہ اور ضخیم کتاب آئی ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نہایت عرق ریزی اور تحقیق سے سرکاری خطوط جمع کیے ہیں۔ سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ان کی محققانہ تصنیف موجود ہے۔ پھر یہ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے نام سے دارالعلوم دیوبند میں ایک اکیڈمی قائم ہوئی ہے۔ اس کے وہ ڈائریکٹر ہیں —— وہ محاضرات میں بنفس نفیس تشریف لانا چاہتے تھے، وہ اس کے بڑے خواہش مند تھے کہ خود آ کر میرے موقف کی کلی تائید فرمائیں۔ فی الوقت وہ کراچی میں مقیم ہیں۔ کافی علیل ہیں۔ ان کے معالجوں نے سفر کی ان کو بالکل اجازت نہیں دی تو ہمارے ایک رفیق ان کا پیغام ٹیپ کرا کے لے آئے تھے جس میں انہوں نے ہر پہلو سے تائید کی ہے، کسی پہلو سے تنقید نہیں کی۔ یہ ٹیپ محاضرات کے پہلے اجلاس میں سنایا گیا —— لہٰذا بتایئے کہ مولانا مدظلہٗ کی یہ تائید میرے لیے سرمایۂ زیست ہے یا نہیں؟

اسی طرح حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ (جو برصغیر پاک و ہند میں علی میاں کے

نام سے مشہور و معروف ہیں) وہ صرف برصغیر ہی کے نہیں بلکہ عالمی شہرت کے عالم اور مفکر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ عالم عرب میں وہ جتنے محبوب و مقبول ہیں اس کا کسی کو اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔ عرب مولانا کی عربی زبان کی تحریر و تقریر سے چٹخارے لیتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر اتنی اعلیٰ عربی میں ہوتی ہے کہ عرب جو اہل زبان ہیں اس کو لوہا مانتے ہیں۔ ان کے ہاں گنتی کے لوگ ہوں گے جو علی میاں مدظلّہٗ کے پائے کی عربی لکھ اور بول سکتے ہوں۔ ان کا خط بھی بڑا حوصلہ افزا آیا ہے۔ ایسے جملے بھی ہیں، جن کو میں یہاں نقل بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح حضرت مولانا گوہر رحمٰن مدظلّہٗ نے اپنے مکتوب گرامی میں اس عاجز کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور جہاد بالقرآن کی تحسین و تائید فرمائی ہے۔ نیز قومی اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے عدم شرکت پر معذرت کی ہے۔

یہ سب کچھ عرض کرنے کی غایت یہ ہے کہ مجھے توقع ہے کہ یہ محاضرات ان شاء اللہ ہماری دعوت کے لیے سنگ میل ثابت ہوں گے۔ اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر جس چھوٹی سی دینی خدمت کا میں نے آغاز کیا تھا، اس پر بہرحال بیس سال بیت گئے ہیں۔ اب تھوڑا وقت باقی ہے لیکن انسان کی یہ کمزوری ہے کہ اس نے جو کام شروع کیا ہو وہ چاہتا ہے کہ اسے پھلتا اور پھولتا دیکھے۔ پھل لاتا ہوا دیکھے۔ اگرچہ سورۃ الصّف میں ایک عجیب نکتہ آیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾ ایک چیز تمہیں بڑی محبوب ہے کہ فتح ہو، کامیابی ہو، نتائج نکلیں اور تمہیں اپنے لگائے ہوئے پودے درخت بنتے اور برگ و بار لاتے نظر آئیں یہ تمہیں پسند ہے۔ اللہ کو تو اس سے غرض ہی نہیں۔ اللہ کو یہ کرنا ہو تو آنِ واحد میں کر دے۔ اللہ تو تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے کہ تم اس کے دین کے غلبہ کے لیے اپنا تن من دھن لگاتے ہو یا نہیں! اللہ کی نگاہ میں تو وقعت آخرت کی کامیابی کی ہے، اس کامیابی کی ہے ہی نہیں۔ یہ تو اونچ نیچ ہے جو ہوتی ہی رہتی ہے: ﴿تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) —— ''وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا''۔ میں ایک نوع کی تعریض ہے کہ تمہاری نگاہ میں اس کی بڑی اہمیت ہوگی، ہماری نگاہ میں تو اسے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون ع ''شمع سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے'' جو ہمارے دین کے لیے اپنا سب کچھ لگا دے وہ کامیاب ہے۔ چاہے ایک قدم ہی چل پایا ہو کہ موت نے آلیا ہو گویا پہلے ہی قدم پر شہادت قدم چوم لے۔

اس پہلو سے یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہمارا

کام بڑھے، پھیلے، پھلے پھولے، نتائج نکلیں۔ میں نے بہرحال اپنی جوانی اور کسی شخص کی عمر کا جو بھی بہترین حصہ ہوتا ہے وہ اس کام میں لگایا ہے۔ اس لیے فطری خواہش ہے کہ یہ کام پائیدار بنیادوں پر آگے بڑھے۔ دعوتِ قرآنی بھی آگے بڑھے اور اقامتِ دین کی جدوجہد بھی صحیح صحیح رخ پر علیٰ منہاج النبوۃ نبی اکرم ﷺ کے نقوش پائے مبارک کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ باقی رہا یہ کہ کون کہاں تک پہنچے گا اور کس منزل تک یہ جدوجہد پہنچے گی یہ کسی کو معلوم نہیں۔ جب قرآن میں خود حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ اے نبیؐ! آپ کہہ دیجیے: ﴿وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ﴾ (الاحقاف:۹) ''مجھے کچھ پتا نہیں میرا کیا بنے گا اور تمہارا کیا بنے گا!'' اور ﴿وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ (الحج) ''مجھے کچھ پتا نہیں جس عذاب کی تمہیں دھمکی دی جارہی ہے وہ آیا سر پر آن کھڑا ہے یا ابھی کچھ مہلت ہے'' —— مجھے کچھ معلوم نہیں ہے —— تو ہمیں کیا پتا! ع ''گہے بر پشت پائے خود نہ بینیم''۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ وہ کبھی خود اپنے پیر کی پشت پر رکھی ہوئی چیز کو نہیں دیکھ پاتا، جسے ہم کہتے ہیں کہ ناک تلے کی شے نظر نہیں آتی۔ دعویٰ وہ یہ کرتا پھرتا ہے کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں وہ دیکھ رہا ہوں، اور یہ مستقبل ہے۔ البتہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرائن و موجود شواہد سے انسان پیش آنے والے واقعات و حالات کا صحیح اندازہ لگا لیتا ہے جسے علامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے۔ ع ''گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود'' —— کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ مستقبل کی کوئی جھلک دکھاتا ہے اور جیسے علامہ نے کہا ہے ؎

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!

اور یہ کہ ؎

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

یہ دونوں کیفیات ہوتی ہیں۔ بہرحال میرے لیے یہ بات بہت ہی موجب اطمینان ہے کہ جو کام میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسی کی تائید و نصرت کے بھروسہ پر شروع کیا تھا اس سمت میں رفتہ رفتہ ہمارے قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ **فَلِلّٰہِ الْحَمْد والمنة!**

میں نے آج کے لیے جو موضوع اپنے سامنے رکھا تھا اس پر گفتگو کا موقع ہی نہیں آیا اور

کافی وقت محاضراتِ قرآنی کے متعلق تاثرات کے بیان میں صرف ہوگیا—— ان ہی محاضرات میں ایک بزرگ' مظفرآباد آزاد کشمیر سے تشریف لائے تھے جن کا نام نامی ہے مولانا سید مظفرحسین ندوی—— مجھے ان کے متعلق یہ اندازہ تو تھا کہ بہت خاموش طبع' بہت شریف النفس اور بہت نیک انسان ہیں۔ اس مرتبہ جب وہ ہمارے ساتھ پانچ چھ دن رہے تو اندازہ ہوا کہ صاحب دل شخصیت بھی ہیں—— ان کو دو اطراف سے فیض بھی پہنچا ہے اور اسی اعتبار سے ان کو دو اطراف سے ذہنی مناسبت بھی ہے۔ وہ جب ندوہ (لکھنؤ) میں زیرتعلیم تھے تو مولانا سید ابوالحسن علی میاں مدظلہٗ اور مولانا مسعود عالم ندویؒ دونوں ان کے استاد تھے۔ مولانا علی میاں ندوی حنفیٔ المسلک ہیں اور مولانا مسعود عالم ندویؒ سلفیٔ المسلک یعنی اہل حدیث تھے۔ مولانا علی میاں بھی اگرچہ جماعت اسلامی کے ابتدائی دور میں اس میں شریک ہوئے تھے لیکن بہت جلد چند اختلافات اور کچھ چیزوں سے مایوس و بددل ہوکر علیحدہ ہوگئے تھے۔ یہ ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد ان کا زیادہ وقت تبلیغی جماعت کے ساتھ گزرا ہے۔ جبکہ مولانا مسعود عالم ندویؒ جب جماعت میں آئے تو تادمِ واپسیں جماعت ہی میں رہے۔ عالم عرب میں مولانا مودودی مرحوم کو متعارف کرانے والے یہی ہیں۔ مولانا مودودی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے اور ان کو عرب میں پھیلانے کا ابتدائی کام مولانا مسعود عالم ندویؒ ہی نے سرانجام دیا ہے۔ وہ بھی ندوہ کے صاحب قلم تھے اور اپنے عربی مضامین کے باعث جو وہاں عربی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے ایک معروف عربی انشا پرداز کی حیثیت سے کافی معروف و مشہور تھے۔ یہ مولانا سید مظفرحسین ندوی مدظلہٗ ان دونوں کے شاگرد ہیں۔ لہٰذا دونوں کے مزاج ایک حسین توازن کے ساتھ ان میں جمع ہیں۔ ان کو میں مجمع البحرین اگر کہوں تو بالکل درست ہوگا۔ ایک طرف ان میں حنفیت بھی ہے دوسری طرف اس میں سختی وتشدد کے بجائے توسع ہے۔ بڑی وسعتِ قلبی ہے۔ پھر یہ کہ ان کا ایک انقلابی مزاج بھی ہے جو ابتدائی دور میں جماعت اسلامی کا تھا اور تبلیغی جماعت کا تقویٰ' تدین' دھیما پن بھی ان کی طبیعت کا ایک جزو ہے۔ مزید یہ کہ ۱۹۴۷ء میں جو جہاد کشمیر میں ہوا تھا تو جہاں تک میرا گمان ہے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کا آغاز کیا تھا۔ اس کی تحریک کرنے والے وہی ہیں۔ انہوں نے ہی لوگوں کو اس مقصد کے لیے جمع اور آمادہ کیا تھا۔ بہرحال اس جہاد کی نمایاں ترین شخصیت وہ رہے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں' البتہ میں اس کی تحقیق کروں گا کہ اس کی تحریک کرنے والے وہی ہیں یا کوئی اور!

سید مظفر حسین صاحب نے محاضرات میں جو تقریر کی اس کے آخر میں انہوں نے محاضرات کے موضوع کے بارے میں تو ایک جملہ کہا کہ مجھے پوری چیز سے اتفاق ہے۔ یہ جملہ ہی بہت قیمتی ہے۔ البتہ انہوں نے اپنی تقریر میں جو اہم بات فرمائی وہ میں ان ہی کے حوالے سے آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں—— دیکھئے ایک تو وہ نقطۂ نظر ہے جو بحیثیت ایک مخلص پاکستانی ہم میں سے ہر ایک کا ہونا چاہیے۔ اور ایک وہ نقطۂ نظر ہے جو ہمارا مومن و مسلم کی حیثیت سے ہونا چاہیے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے ہمارے عمل میں مضبوطی اور پختگی آئے گی—— انہوں نے یہ بات بایں الفاظ نہیں کہی ہے۔ لیکن اس کا جو مفہوم میں نے سمجھا ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں—— ہمارا خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر بھی اگر ہو کہ یہ پاکستان ہمارا ملک ہے، ہمارا وطن ہے۔ اسے مشرق و مغرب سے خطرات لاحق ہیں۔ ہمارے دشمنوں کے بڑے مضبوط حلقے (lobbies) ہمارے ملک کے اندر موجود ہیں۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد یہاں ہنگامے ہوتے رہے ہیں۔ کبھی لسانی فسادات ہو گئے۔ جیسے کہ بھٹو کے دور میں سندھ میں ہو گئے اور اس موقع پر اندیشہ لاحق ہوا تھا کہ پتا نہیں اب یہ کشتی اس گرداب سے نکل سکے گی یا نہیں؟ کبھی کبھی سنی شیعہ فسادات ایک ہولناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ فی الوقت قادیانیوں کا جارحانہ انداز امن و امان کے نقض کا موجب بن سکتا ہے۔ اب ذہنوں میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کی بقا کے لیے، اس کے استحکام کے لیے کوئی سہل نسخہ بھی ہے یا نہیں! ٹھیک ہے طویل نسخے موجود ہیں: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (الانفال: ٦٠). تیاری جاری رکھو۔ جتنی بھی امکان میں ہے۔ اتحاد پیدا کرو۔ جو بھی اپنے ranks کے اندر اختلافات ہیں انہیں دور کرو۔ یکجہتی پیدا کرو۔ علاقائی سطح پر انصاف کا معاملہ ہو۔ لوگوں کو ان کے جائز حقوق دیے جائیں تاکہ انہیں اطمینان ہو۔ وہ احساس محرومی میں مبتلا نہ ہوں۔ پھر یہ کہ اگر خارج میں ہمارے کچھ دشمن ہیں تو خارجہ پالیسی کے تحت کچھ دوست بھی تلاش کیے جائیں۔ ان میں سے کسی چیز سے بھی اختلاف نہیں ہے لیکن یہ وہ امور ہیں کہ خالص مادہ پرستانہ اور لادینی نقطۂ نظر رکھنے والے ذہن کا آدمی بھی ان کے متعلق سوچے گا۔ دشمنوں کے مقابلہ میں دوستوں کی تلاش، ان سے معاہدے، اگر معاہدے نہ ہوں تو کوئی اطمینان ہو۔ یہ باتیں تو ہر شخص سوچے گا۔ اسلحہ جمع کرنے کے متعلق ہر ملک سوچے گا کہ کتنا ہم خود بنا سکتے ہیں اور کتنا دوسروں سے لے سکتے ہیں اور وہ کہاں سے مل سکتا ہے، کہاں سے نہیں مل سکتا۔ یہ سوچیں تو

ہر محبّ وطن کی ہوں گی خواہ وہ مومن و مسلم ہو یا کافر ہو ـــــ لیکن سید صاحب موصوف نے دو آیات کے حوالے سے اس کا آسان ترین نسخہ بتایا ہے جس کے مؤثر ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے جو تیر بہدف (sure shot) ہے۔ اس نسخہ کا پہلا جزو تو سورۂ محمد کی آیت ۷ میں ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ﴾ ''اے اہل ایمان اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ تو یہ اس نسخہ کا پہلا جزو ہے تم اللہ کی مدد کرو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اب حدیث میں اس انداز کی بہت سے باتیں آئی ہیں۔ فرمایا گیا کہ اگر تم تمام تفکرات کو ایک فکر میں مدغم کرو ـــــ مجھے اس مدغم کے لفظ سے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کے دور میں جب ایران کا نادر شاہ علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا تو علاقہ کے ذمہ دار پرچے پر پرچے بھیج رہے تھے کہ بادشاہ سلامت کچھ کیجیے' دشمن منزل بمنزل دارالحکومت کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن شاہ صاحب کی جو رنگ رنگیلی محفلیں جما کرتی تھیں' شراب نوشی ہوتی رہتی تھی۔ لہٰذا شاہ کی طبع پر ان پرچوں کا پڑھنا بھی گراں گزرتا تھا تو جو رقعہ آتا تھا اسے وہ بغیر پڑھے شراب کے جام میں پھاڑ کر ڈال دیتے تھے کہ ع

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ!

یہ انداز مطلوب ہے کہ دنیا کے تمام تفکرات کو غرق کر دو ایک فکر میں اور وہ فکر آخرت ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ ارشادِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالہ سے ذہن نشین کر لیجئے۔ فرمایا الصادق والمصدوق ﷺ نے: ((مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ)) ''جس شخص نے اپنے تمام تفکرات کو بس ایک ہی فکر یعنی اپنی آخرت کی فکر میں سمو دیا تو اللہ ذمہ لیتا ہے اُس شخص کے تمام دنیا کے تفکرات کو دور کرنے کا'' ـــــ بتایئے کہ اس سے زیادہ آسان نسخہ کوئی ہے؟ بس اس کے لیے تھوڑے سے ایمانِ حقیقی کی ضرورت ہے۔ اگر وہ تھوڑا سا واقعی یقین کہیں سے میسر آ جائے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

یہ یقین ہے اصل مسئلہ۔ اسی طریقہ سے ایک طویل حدیث کے درمیان میں آتا ہے: ((مَنْ كَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِیْهِ كَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ)) ''جو شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے' اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے''۔ اب آپ

بتایئے کہ جو ایک انسان اپنے ایک بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے‘ اللہ کی نگاہ میں اس کی اتنی قدر ہے کہ اس کی ضرورت خود وہ پوری فرماتا ہے تو اگر اللہ کے دین کی ضرورت کوئی پوری کر رہا ہو تو اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ کیا ہوگا! یہ ہے انداز اس آیت کریمہ کا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ﴾ ’’اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا‘‘۔ پھر تمہارے قدموں میں کوئی لغزش نہیں ہوگی‘ تم ثابت قدم رہو گے تو یہ ہے اس نسخہ کا جزو اوّل ـــــ

دوسرا جزو کیا ہے؟ اسے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۰ سے سمجھئے۔ فرمایا: ﴿اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ ’’اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکے گا‘‘۔ یہ بڑی یقین دہانی والی بات ہے۔ جس کا پشت پناہ اللہ بن گیا ہو‘ جس کا مددگار اللہ ہو تو اب کیا کوئی اللہ پر غالب آ سکتا ہے؟ لیکن یہاں ایک دھمکی بھی ہے: ﴿وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾. ہوش میں آؤ ’’اگر اللہ ہی تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون ہے وہ جو تمہاری مدد کر سکے اس کے بعد‘‘ ـــــ امریکہ بچالے گا! میزائل بچالیں گے! اسلحہ بچالے گا! اگر اللہ نے چھوڑ دیا تو کوئی بچانے والا نہیں۔ نہ کثرت تعداد بچاتی ہے۔ نہ کوئی اور مادی شے بچاتی ہے۔ جنگ حنین میں بارہ ہزار مسلمان تھے‘ لیکن ابتدا میں شکست ہوئی: ﴿وَیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾ (التوبۃ: ۲۵). حنین میں جنگ کے دن تمہیں اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا۔ نتیجہ دیکھ لیا! ـــــ اس بات کو جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کفار کے ساتھ خالص مادّی سطح پر معاملہ کرتا ہے۔ اگر ان کی آپس کی جنگ ہے تو ان کا معاملہ تو حساب کتاب سے ہوگا۔ اسباب و وسائل کی کمی بیشی فیصلہ کن ہوگی۔ مسلمان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس کے ساتھ معاملہ کے اللہ تعالیٰ کے معیارات بالکل جدا ہیں۔ یہ معیار معلوم کرنا ہے تو حضرت طالوت کا جالوت جیسے باجبروت اور عسکری لحاظ سے نہایت مضبوط لشکر سے مقابلہ کا انجام دیکھو۔ جہاں ان مؤمنین کا یہ قول قرآن مجید نے نقل کیا ہے جن کو یقین تھا کہ مرنے کے بعد اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (البقرۃ) ’’بارہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے‘ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے‘‘ یہ معیار معلوم کرنا ہے تو معرکۂ بدر دیکھو جسے اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان قرار دیا ہے۔ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والا دن۔ جس روز اللہ تعالیٰ کی مدد

سے تین سو تیرہ بے سروسامان مؤمنین صادقین ایک ہزار کفار کے لشکر پر غالب آئے جو ہر طرح کے ہتھیاروں اور کیل کانٹوں سے لیس اور مسلح تھے۔

ہم مؤمنین صادقین اور کفار کے معاملہ کے تناسب کو دنیوی معیارات سے گڈمڈ کرتے ہیں اور اصل صورت حال یہ ہے کہ عام طور پر ہم اپنے معاملات کو ان معیارات پر سوچنے کے عادی ہوگئے ہیں جو اللہ کے پیمانے اور معیارات کفار کے لیے ہیں۔ مسلمان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ان سے تو مستقل وعدہ ہے کہ: ﴿وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ﴾ ''تم ہی غالب و سربلند رہو گے''۔ لیکن یہ وعدہ مشروط ہے اس سے کہ: ﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴾ ''بشرطیکہ تم مؤمن ہو'' یعنی سربلندی اور غلبہ کے لیے مؤمن صادق ہونا لازمی شرط ہے —— وہ بھی فرداً فرداً نہیں بلکہ جماعتی اور منظّم طور پر۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

تو سید مظفر حسین ندوی مدظلہٗ نے یہ نسخہ تجویز فرمایا کہ اگر ہم بحیثیت قوم وملت اللہ کے دین کے حامی اور مددگار بن جائیں اور اسے اپنے ملک میں مخلصانہ جذبہ کے ساتھ صحیح خطوط پر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ انفرادی طور پر خود بھی حقیقی مؤمن بن جائیں اور اجتماعی نظام کو بھی کتاب وسنت کی تعلیمات کے مطابق استوار کر کے قائم و نافذ کر دیں تو ان شاء اللہ ہمارے ساتھ معاملہ وہ ہوگا جس کی بشارت ان آیات میں دی گئی ہے: ﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ﴾ اور ﴿اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ ۚ﴾—— اصل میں یہ باتیں تو بالکل سامنے کی ہیں' دو اور دو چار کی نوعیت کی ہیں۔ متعدد بار یہ مضمون اس انداز میں بیان بھی ہوا ہوگا' لیکن انہوں نے جس پُرتاثیر انداز سے بیان کی اس کی شان ہی نرالی تھی۔ مجھے اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ واقعہ ہے کوئی کہانی نہیں ہے کہ امیر افغانستان کی والدہ شدید بیمار تھیں۔ مقامی اطباء حکماء بالکل مایوس ہو چکے تو علاج کے لیے حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی سے بلایا گیا۔ حکیم صاحب نے دیکھا بھالا اور پھر نسخہ لکھوانا شروع کیا تو امیر کابل نے کہا کہ یہ ساری دوائیاں تو ہم استعمال کرا چکے ہیں۔ اس پر حکیم اجمل خاں صاحب نے جواب دیا کہ ''بدست اجمل خان بخور!'' یہ دوائیاں اب اجمل خاں کے ہاتھ سے کھلاؤ۔ تو دوائیوں کا معاملہ اپنی جگہ ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس کے ہاتھ سے اور کس کی تجویز اور کس کے نسخے سے وہ دوائی کھلائی

جارہی ہے۔اس میں بڑا فرق ہے تو میں نے محسوس کیا کہ سید صاحب مدظلہ نے جس طرح دل اور جذبے میں ڈوب کر یہ بات کہی ہے اور جس یقین کے ساتھ کہی ہے۔ یہ قال نہیں حال معلوم ہوتا تھا۔اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا اور اسی وقت میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ ان کی بات انہی کے حوالے سے جمعہ کی اجتماع میں اپنے الفاظ میں آپ حضرات کو منتقل کروں گا۔

اب اس مضمون کو تھوڑا سا اور آگے بڑھایئے۔ نبی اکرم ﷺ کی نصرت کا خاص طور پر قرآن مجید میں دو جگہ ذکر آیا ہے۔ایک جگہ مثبت انداز میں اور ایک جگہ منفی اسلوب سے —— مثبت والے انداز کی جو آیت ہے وہ تو ہمارے ایک کتابچے کی اساس و بنیاد ہے۔ وہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے آخری جزو پر مشتمل ہے جس میں نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں' اللہ تعالیٰ نے چار الفاظ کے حوالے سے معین فرمائی ہیں —— اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا تھا کہ جب میرے الرسول النبی الامی مبعوث ہوں گے تو میری ایک رحمتِ خاص ہے وہ میں نے محفوظ (reserve) کی ہوئی ہے۔ وہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو ہمارے اس الرسول النبی الامّی کے ساتھ یہ معاملہ کریں گے۔ وہ اُس رحمت کے حق دار ہوں گے —— وہ کیا معاملہ ہے! اسے ان الفاظ مبارکہ میں بیان کیا: ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف) پس جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے اور ان کی تعظیم و توقیر' عزت و احترام کریں گے اور ان کی نصرت و مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو ان کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو کامل فلاح ان ہی کے لیے ہے۔ یہاں ''النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ'' سے مراد قرآن مجید ہے۔اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال اس موضوع کو جو حضرات تفصیل سے سمجھنا چاہیں ان کو میں اس موضوع پر اس کتابچہ کے مطالعہ کرنے کی دعوت دوں گا[1] —— تو یہاں مثبت انداز میں فرمایا گیا کہ اگر تم فلاح و کامیابی چاہتے ہو تو اس کی چار شرائط ہیں: حضور ﷺ پر ایمان' حضورؐ کی تعظیم' حضورؐ کی نصرت اور قرآنِ حکیم کا اتباع —— اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کی نصرت و مدد سے کیا مراد ہے؟ کیا حضورؐ کو اپنی کسی ذاتی ضرورت کے لیے مدد درکار تھی! کیا آپؐ کو اپنے کسی گھریلو مشکل کے حل کے لیے مدد درکار تھی۔ کیا آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں اپنی مالی مدد کے لیے دست سوال دراز کیا! —— میرے لیے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا

(۱) ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' کے نام سے یہ کتابچہ مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔(مرتب)

ہے اس واقعہ پر جب بھی اس کا تصور آجاتا ہے کہ جو معاملہ حضورﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کیا۔ ان سے زیادہ جگری اور کون ہوگا جن کے متعلق فرمایا: ((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا)) حضورﷺ تو یہاں ایک باہمہ اور بے ہمہ شخص کا نقشہ پیش فرما رہے ہیں۔ اس دنیا میں خلیل میرا کوئی نہیں ——— فرماتے ہیں کہ ''اگر میں کسی کو اس دنیا میں خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا'' میرا خلیل صرف اللہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حضورﷺ کے اندر محبت اور شفقت اتنی بے پایاں تھی کہ ہر صحابی محسوس کرتا تھا کہ حضورﷺ میرے خلیل ہیں۔ یہ تو ظرف وحسن سلوک کا معاملہ ہے کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ شاید آپ کی نظر عنایت والتفات مجھ ہی پر ہے۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ تو حدیث ہی ان الفاظ سے روایت کرتے ہیں: اَوْصَانِیْ خَلِیْلِیْ ''میرے دوست' میرے خلیلﷺ نے مجھے یہ وصیت کی تھی'' ——— تو جس واقعہ کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مکہ میں مشرکین نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بنی ہاشم کے علاوہ قریش کے تمام خاندان کے چند نوجوان رات کو چھپ کر حملہ کریں گے اور یکبارگی حضورؐ کو شہید کردیں گے تاکہ بنی ہاشم کسی ایک خاندان کو موردِ الزام نہ ٹھہرا سکیں۔ حضورؐ کو اس سازش کا علم ہوگیا تھا لیکن اللہ کے اذن کے بغیر نبی اپنا شہر چھوڑ نہیں سکتا۔ لہٰذا حضورؐ بھی ہجرت کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں اور ابوبکرؓ بھی منتظر ہیں ——— حالات روز بروز مخدوش ہوتے جارہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو تشویش لاحق تھی کہ کہیں مشرکین مکہ یہ آخری اقدام نہ کر بیٹھیں۔ لہٰذا وہ کافی بے چین تھے اور حضورؐ سے بار بار پوچھتے تھے کہ اجازت آئی یا نہیں اور حضورؐ جواب میں فرماتے کہ ابھی اجازت نہیں آئی ——— ایک دن دوپہر کے وقت نبی اکرمﷺ حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ اس طرح دوپہر کے بعد کسی کے گھر جانا عرب کے تمدن اور روایات کے اعتبار سے ایک غیر معمولی بات تھی۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ دوپہر کے غیر معمولی وقت ہمارے گھر تشریف لائے اور آتے ہی والد صاحب سے فرمایا کہ خاص بات ہے تخلیہ کرادو۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ کی اہلیہ عائشہؓ کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں ——— اس وقت تک حضرت عائشہؓ آپؐ کے نکاح میں آچکی تھیں ——— حضورؐ نے فرمایا ہجرت کی اجازت آگئی ہے۔ اب حضرت ابوبکرؓ کی خوشی کی جو کیفیت ہوگی اس کا آپ اندازہ کر لیجیے کہ انہوں نے حضورؐ کو بتائے بغیر دو اونٹنیاں خوب کھلا پلا کر تیار کی ہوئی تھیں۔ اونٹ کا یہ معاملہ ہے کہ اگر اسے خوب کھلایا پلایا جائے تو اس کے اندر قوت جمع

(energy store) ہو جایا کرتی ہے۔ دور دراز کا سفر ہے۔ پھر تعاقب کا بھی اندیشہ ہے لہٰذا حضرت ابوبکرؓ نے دو تیز رفتار اونٹنیاں خوب فربہ کر رکھی تھیں۔ لہٰذا بڑے مسرت کے انداز میں عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ میں نے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں —— اب ہے وہ مرحلہ حضورؐ تھوڑی دیر توقف فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ ''ٹھیک ہے ایک اونٹنی میں استعمال کروں گا اور میں اس کی قیمت ادا کروں گا'' —— یہ سن کر رو پڑے حضرت ابوبکرؓ اور عرض کیا: ''حضورؐ کیا یہ جان اور مال کسی اور کے لیے ہیں!''—— یہ تو ان کے الفاظ ہیں۔ میں ان کی تعبیریوں کیا کرتا ہوں کہ حضورؐ مجھ سے بھی اتنی مغائرت!—— تو یہ تھا نبی اکرم ﷺ کا معاملہ —— کس کام کے لیے آپؐ کو مدد درکار تھی۔ وہ مدد تھی اللہ کی مدد۔ اللہ کے دین کی مدد۔ اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کی مدد۔ اللہ کی کبریائی کے نظام کو برپا اور قائم کرنے کے کام میں مدد —— حضورؐ کو کوئی ذاتی مدد' کوئی خاندانی مدد' کسی اور مسئلہ میں استمداد! معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ —— سیرتِ مطہرہ میں تو حضورؐ کی بے نفسی کا یہ عالم سامنے آتا ہے کہ جب آپ سواری پر تشریف فرما ہوتے تھے اور آپ کا کوڑا زمین پر گر جاتا تھا تو سواری کو بٹھانا' اس سے اترنا اور کوڑا خود اٹھانا آپ کو اس سے کہیں زیادہ پسند تھا کہ کسی سے فرمائیں کہ ذرا مجھے کوڑا اٹھا دینا —— تو حضورؐ کو جو نصرت مطلوب تھی وہ اللہ کے دین کے غلبہ اور اس کی کبریائی کے نفاذ کے لیے مطلوب تھی۔ اسی نصرت کا مثبت انداز میں یہاں ذکر آیا ہے: ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

اب اسی کو منفی طور پر سورۃ التوبہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ حسن اتفاق ہوا ہے کہ یہ معاملہ بھی اسی ہجرت کا ہے جس کا ایک پہلو میں نے آپ حضرات کو ابھی سنایا۔ میرے ذہن میں یہ بات پہلے اس طرح نہیں تھی —— سورۃ التوبہ میں فرمایا: ﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (آیت ۴۰)—— غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ جو تم سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو اگر تمہاری ہمتیں پست ہوئی جا رہی ہیں' اگر تم زمین میں دھنسے جا رہے ہو ﴿اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ﴾ تمہارے پاؤں من من بھر کے ہو گئے ہیں' تمہیں حضور ﷺ کے ساتھ قیصر روم کے خلاف جہاد و قتال کے لیے نکلنا بہت شاق اور گراں گزر رہا ہے' تو ذرا یاد کرو اللہ محتاج نہیں ہے۔ اگر تم اس مرحلہ پر ہمارے رسول کی مدد نہیں

کرو گے تو اللہ نے ہر مرحلہ پر اپنے رسول کی مدد کی ہے۔ جب یہ صرف دو تھے اور غار میں تھے تو کون تھا ان کو دشمنوں سے بچانے والا! ——— جب کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے لیے اور اپنی جان کے لیے نہیں بلکہ حضورؐ کی جان کی وجہ سے اس قدر پریشان ہوئے کہ سرگوشی سے عرض کیا کہ حضورؐ ان دشمنوں نے جو غار کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں اگر قدموں کی طرف جھک کر غار میں جھانک بھی لیا تو ہم دیکھ لیے جائیں گے——— ہوا یہ کہ غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا تھا۔ اور نیچے کبوتری کا گھونسلا تھا۔ جس میں انڈے موجود تھے۔ جو علامت تھے اس بات کی کہ کوئی فرد غار کے اندر داخل نہیں ہوا۔ ہوتا تو جالا ٹوٹ جاتا۔ گھونسلہ اور انڈے بکھر جاتے ——— ذرا قدرت الٰہی کا اندازہ کیجئے کہ بچاتا ہے تو مکڑی کے جالے اور کبوتری کے گھونسلے اور انڈوں سے۔ ماہر ترین کھوجی غار تک تعاقب کرنے والے مشرکین کے اس دستہ کو لے آیا ہے جس کا سردار ابوجہل ہے جس کی ذہانت اور زیرکی کی وجہ سے مشرکین قریش اسے ابوالحکم کہتے ہیں۔ کھوجی اصرار کر رہا ہے کہ میرا علم اور میرا تجربہ بتاتا ہے کہ محمد (ﷺ) اور ابوبکر (رضی اللہ عنہ) دونوں اس غار تک آئے ہیں اور یہاں سے آگے نہیں گئے' لہٰذا ہوں نہ ہوں غار میں ہیں——— اب غور کیجئے کہ کیا بات تھی! وہ کیوں رکے رہے۔ وہ ذرا جھک کر دیکھ لیتے! کس قدر باریک پردہ ہے! لیکن اصل بات تو اس طرح نصرتِ الٰہی کا ظہور تھا۔ انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں' یُصَرِّفُ کَیْفَ یَشَآءُ وہ تو جس طرف چاہے ان کو پھیر دے۔ لہٰذا ابوجہل غار کے دہانے پر کھڑا ہے اور پکار رہا ہے کہ اے محمد! (ﷺ) اگر اندر ہو تو نکل آؤ' میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں قتل نہیں کروں گا بلکہ زندہ مکہ لے جاؤں گا——— اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھبرائے اور حضور ﷺ نے تسلی میں یہ بات فرمائی: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ''کیوں گھبراتے ہو اے ابوبکر! اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔ پس اللہ نے مدد فرمائی تو اس طرح فرمائی——— البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کے مدعیان بھی مدد کرتے ہیں کہ نہیں۔ یہی ان کا امتحان ہے۔ زندگی کا فلسفہ یہی ہے کہ یہ امتحان کے لیے ہے ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

تمہارے ایمان کا امتحان ہے۔ تمہارے شوقِ عبادت کا امتحان ہے۔ تمہارے جذبۂ انفاق کا امتحان ہے۔ تمہارے طرزِ عمل کا امتحان ہے۔ تمہارے جوشِ جہاد کا امتحان ہے۔ تمہارے ذوق

شہادت کا امتحان ہے۔ امتحان کے سوا اور کچھ یہاں مطلوب نہیں: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك:٢) موت و حیات کے اس سلسلہ کی غایت ہی جانچنا اور پرکھنا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ـــــ اس نصرت کو سمجھنے کے لیے سورۃ الاعراف اور سورۃ التوبہ کی یہ آیات ذہن نشین کر لیں۔ اب دو آیات کا مفہوم مجھے اور بیان کرنا ہے جس کے بعد میری آج کی گفتگو مکمل ہو جائے گی۔

اب دیکھئے کہ نصرت اصلاً درکار ہے دین کی۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں نے آج شروع کی دعاؤں میں وہ دعا بھی شامل کی جو خطبہ میں ہم ہمیشہ مانگتے ہیں کہ: اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَّصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ. ''اے اللہ مدد فرما ہر اُس بندے کی جو مدد کرے تیرے نبی محمد ﷺ کے دین کی اور ہم کو ان ہی میں سے بنا دے' انہی میں شامل فرما دے''۔ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَهُمْ ''اور ہر اس شخص کو رسوا کر دے' اپنی توفیق اس سے سلب کر لے' اس کی مدد سے دستکش ہو جا جو تیرے نبی محمدؐ کے دین سے دستکش ہو رہا ہو اور اے اللہ ہمیں ان کے ساتھ شامل نہ کیجیو''۔ میں اس کی تعبیر یوں کیا کرتا ہوں کہ اے اللہ! ہم کبھی دھوکہ سے بھی ایسے لوگوں کے پھندے میں نہ پھنس جائیں۔ معاشرے میں ایسے لوگ ہر دور میں موجود رہتے ہیں جو گندم نما جو فروش کے زمرے میں آتے ہیں۔ دکھاتے گندم ہیں اور بیچتے جو ہیں۔ بظاہر دین کی خدمت ہے اصل میں دنیا مطلوب ہے۔ کوئی چودھراہٹ مقصود ہے شہرت درکار ہے۔ کسی اور پہلو سے کوئی منفعت پیش نظر ہے تو ایسے گندم نما جو فروش موجود ہوتے ہیں۔ پس ہم کسی کی گندم نمائی سے دھوکہ کھا کر اس کے ساتھی نہ بن جائیں۔ یہ ہے دعا۔ اس میں آپ نے دیکھا کہ نصرت و مدد کس کی درکار ہے! دین کی ـــــ لیکن اس دین کی نسبتیں دو ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ بات جو میں دو مزید آیات کے حوالے سے سمجھانا چاہتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ دین کس کا ہے؟ اللہ کا۔ نبی کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے۔ دین کی ایک نسبت ہماری طرف بھی ہے: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۝﴾ ''تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے''۔ میرا دین' تمہارا دین' اس کا دین' یہ سب نسبتیں مجازی ہیں۔ دین محمد ﷺ' یہ بھی مجازی نسبت ہے۔ دین کی اصل نسبت کس کی طرف ہے! اللہ کی طرف ''دین اللہ''۔ اس لیے کہ دین اس کو کہتے ہیں کہ کسی ہستی یا ادارہ کو مطاع مطلق مان کر اس کی اطاعت

کے مطابق پوری زندگی کا نقشہ بنایا جائے—— یہ نقشہ قبول کرنے والے کا دین ہوگا—— اگر کسی بادشاہ کی حاکمیت کو مطلق العنان تسلیم کرلیا گیا اور اس کی Absolute Sovereignity مان لی گئی۔ اسے قانون سازی کا مختارِ کل تسلیم کرلیا گیا کہ وہ جو چاہے قانون بنائے جس چیز کو چاہے حلال قرار دیدے۔ جس کو چاہے حرام ٹھہرادے تو اس نظریہ کے تحت جو نظام بنے گا اور رائج ہوگا وہ دین الملک کہلائے گا۔ یہ لفظ سورۂ یوسف میں آیا ہے: ﴿مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ﴾ (آیت ۷۶)۔ اس کو آپ قیاس کر لیجیے جمہور کی حاکمیت کے اصول پر، جمہور کے قانون سازی کے اختیارِ مطلق کے اصول پر —— اس اصول پر جو نظام بنے گا وہ کہلائے گا دین الجمہور—— اور اللہ کو حاکم مطلق مان کر جیسے ہم نے تبرکاً قرار دادِ مقاصد میں مانا ہوا ہے۔ تبرکاً ہی ہے ورنہ اندر خانہ آج تک تو مانا نہیں۔ آج کی تاریخ تک تو مانا نہیں۔ جھوٹ کہتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ مانا ہوا ہے۔ فلاں چیز مستثنیٰ فلاں چیز مستثنیٰ، تو کیا مانا! خاک مانا؟ جس چیز میں بیگمات ناراض ہوں، وہ مستثنیٰ، جس میں امریکہ ناراض ہو وہ مستثنیٰ، جس میں کارخانہ دار ناراض ہو وہ مستثنیٰ، جس میں زمیندار ناراض ہو وہ مستثنیٰ۔ تو کیا مانا! اللہ کو حقیقتاً حاکم مطلق مان لینا یہی تو ایک بات ہے۔ یہی تو توحید ہے ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

لیکن یہ بڑی بھاری بات ہے۔ قولِ ثقیل ہے۔ ایک اللہ کا بندہ بن جانا انفرادی اعتبار سے بہت مشکل ہے اور اجتماعی اعتبار سے صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اصول پر پورے نظام زندگی کو استوار کر دینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام تو وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا تھا۔ کوشش ہم کر سکتے ہیں، کوشش کرنے ہی میں ہمارے لیے کامیابی ہے، کر لینا آسان کام نہیں ہے۔ بہرحال عرض یہ کر رہا تھا کہ اللہ کو حاکم مطلق مان کر جو نظام بنے گا وہ کہلائے گا دین اللہ! —— یہ اصطلاح سورۃ النصر میں استعمال ہوئی ہیں: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝﴾

تو دین اصلاً اللہ کا ہے اس کے غلبہ اور اس کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا کس کی مدد ہوئی؟ اللہ کی مدد! اس کو غالب اور سربلند کرنے کے لیے اللہ نے اپنا رسول ﷺ بھیجا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ

الْمُشْرِكُوْنَ﴿۹﴾﴾(الصف) ''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر تا کہ وہ غالب کرے اسے کل کے کل دین پر چاہے یہ بات مشرکوں کو کتنی ناگوار گزرے''۔تو دین غالب کرنے کا فرض منصبی کس کا؟ رسول ﷺ کا! اگر تم اس دین کی سربلندی اور غلبہ کے لیے تن من دھن لگا رہے ہو' رسولؐ کے دست و بازو بن رہے ہو تو کس کی مدد ہوئی! رسولؐ کی مدد۔تو یہ دو نصرتیں ہوگئیں۔دین کی مدد' دین کی نصرت ایک طرف اللہ کی مدد و نصرت ہے اور دوسری طرف رسولؐ کی مدد و نصرت ہے۔اس کے لیے دو آیات نوٹ کر لیں۔

ایک آیت تو سورۃ الحدید کی (آیت ۲۵) ہے۔یہ آیت کریمہ قرآن مجید کی جامع ترین آیات میں سے ایک ہے۔میں اس وقت اس کا ترجمہ سنا سکتا اور مختصر تشریح کر سکتا ہوں۔چونکہ اس سے زائد کے لیے وقت نہیں ہے۔فرمایا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ﴾''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو روشن تعلیمات اور واضح نشانیوں کے ساتھ''۔بینات کا دونوں پر اطلاق ہوگا۔جو تعلیمات وہ لے کر آئے وہ بھی روشن اور فطرت انسانی کی جانی پہچانی اور وہ جو معجزے لائے وہ بھی بین' واضح اور روشن۔﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾''اور ان کے ساتھ ہم نے کتاب بھی نازل کی' میزان بھی اتاری'' میزان سے مراد سب کے نزدیک شریعت ہے وہ نظامِ عدل جو اللہ نے دیا۔معاشی میدان میں یوں عدل و انصاف ہوگا۔سیاسی میدان میں یوں عدل و انصاف ہوگا۔شوہر اور بیوی کے حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔آجر اور مستاجر کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔بائع اور مشتری کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو میں توازن ہوگا۔شریعت کی میزان میں ہر ایک کا حق تُلے گا اور ایک کا حق دوسرے کا فرض ہے۔والدین کے جو حقوق ہیں اولاد پر وہ اولاد کے والدین کے بارے میں فرائض ہیں۔شوہر کے بیوی پر جو حقوق ہیں وہ بیوی کے شوہر کے متعلق فرائض ہیں۔بات تو ایک ہی ہے۔پس پوری اجتماعی زندگی میں حقوق و فرائض کا ایک توازن ہے —— اب غور کیجیے کہ سب کچھ کیوں کیا گیا کہ اللہ نے رسول بھیجے' تعلیمات اتاریں' بینات اتاریں۔کتاب نازل فرمائی' میزان اتاری' کس لیے! کاہے کے لیے! یہ کوئی اللہ کی hobby ہے' کوئی مشغلہ ہے' کوئی تفریح ہے یا کوئی کارِعبث ہے! معاذ اللّٰہ ثم معاذ اللّٰہ —— ہم نے یہی سمجھا ہے کہ بے مقصد کام ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔اس دین کو' اس قرآن کو' اس شریعت کو ایک طرف رکھے رہیے ع ''چشم عالم

سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب'' —— اسے بندر کھنے ہی میں عافیت ہے۔ یہ پٹارہ کھل گیا تو ہماری خیر نہیں۔ ہماری چودھراہٹوں کی خیر نہیں، ہماری پیشوائیوں کی خیر نہیں۔ علامہ اقبال نے بڑے سادہ الفاظ میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے:

جانتا ہوں میں یہ اُمت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

نئے تقاضے ابھر رہے ہیں، نئے نظریات جنم لے رہے ہیں اور محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ؎

جو حرف قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کچھ تقاضے ہیں جو سامنے آ رہے ہیں، لیکن ہمارا وطیرہ یہ ہے کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اور:

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے!
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اور:

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات
ہیں کتاب اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم!
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

ان گتھیوں کو سلجھاؤ۔ گویا اسی کے سمجھنے سمجھانے پر دنیا و آخرت کی فلاح اور نجات کا دارومدار ہے۔ پھر یہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اب تو نور و بشر کی گرما گرم بحث ہی نہیں جدال ہو رہا ہے۔ اسی میں لڑتے اور لڑاتے رہو۔ حضور ﷺ کا سایہ تھا یا نہیں تھا۔ اسی جھگڑے میں الجھاتے رہو۔ انہی مسائل پر مناظرے ہوں۔ پھر بڑے بڑے میلے ٹھیلے ہیں۔ عرس ہیں۔ کبھی فلاں بزرگ

کا عرس ہے کبھی فلاں کا۔ اخبارات میں روزانہ ہی کسی نہ کسی کے عرس کے بڑے بڑے اشتہار چھپتے رہتے ہیں۔ مزاروں کی تصاویر بڑی عقیدت سے خریدی اور گھروں میں آویزاں کی جا رہی ہیں۔ یہ ہیں وہ چیزیں جو بطور کھلونا دے دی گئی ہیں ع ''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!''

یہ باتیں دکھی دل کی پکار بن کر نوکِ زبان پر آ گئیں۔ سلسلۂ کلام یہ ہے کہ غور طلب بات یہ ہے کہ الکتاب (قرآن مجید) کس لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھی اور المیزان (شریعت اسلامی) کس لیے اللہ تعالیٰ نے اتاری تھی۔ اس کو نہایت وضاحت وصراحت کے ساتھ آگے بیان فرمایا گیا: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ تاکہ لوگ عدل وانصاف پر کاربند ہوں۔ قائم ہوں۔ یہ ترازو نصب کیا جائے۔ یہ دھرم کنڈ اصرف دکھاوے کے لیے نہ ہو بلکہ اس میں ہر چیز فی الواقع تلے اور حق دار کو اس کا پورا حق ملے۔ لیکن یہ ترازو نصب کون ہونے دے گا! جو اپنے حق سے زیادہ لے رہا ہے وہ پسند کرے گا کہ میزانِ عدل سے تول کر لے؟ جو محروم ہیں وہ تو چاہیں گے کہ بھائی ترازو سے تولو۔ یہ کیا کہ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کر لے جا رہے ہو اور ہمیں ایک مٹھی پر ٹرخا رہے ہو وہ تو چاہیں گے۔ چاہے ہمت نہ ہو' جرأت نہ ہو کھڑے نہ ہو سکیں۔ لیکن جو اپنے حق سے زائد لے رہے ہیں وہ کبھی چاہیں گے کہ عدل وقسط کی میزان قائم ہو' نصب ہو —— اور یہ وہ لوگ ہیں جو چاہے دلیل سے قائل بھی ہو جائیں بالفعل مانیں گے کبھی نہیں۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں باتوں سے کبھی ماننے والے نہیں۔ اسی لیے فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ ''ہم نے لوہا بھی اتارا ہے کہ نہیں''۔ پنجابی میں کہتے ہیں کہ نہیں ''چار کتاباں عرشوں آیاں پنجواں آیا ڈنڈا!'' اسی کو اقبال نے یوں کہہ دیا ع ''عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد'' —— لوگ میری باتوں سے گھبراتے ہیں کہ یہ کیا باتیں کرتا ہے! لیکن میں قرآن حکیم کی انقلابی دعوت پیش کرتا ہوں —— اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا اتارا ہے'' کیوں اتارا ہے! اس لیے کہ اس میں جنگ کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے اس میں کچھ دوسری منفعتیں بھی ہیں۔ چمٹا' پھکنی' توا' پرات اور بھی روزمرہ کے استعمال کی ہزاروں چیزیں بھی اس لوہے سے بنتی ہیں لیکن حقیقت میں اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس سے اسلحہ بنایا جائے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ —— اور یہ اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس اسلحہ کی طاقت کو وہ لوگ جو میرے دین کے ماننے والے ہیں جو میرے نازل کردہ نظام عدل وقسط پر ایمان رکھتے ہیں' ہاتھ میں لیں اور ان لوگوں کی سرکوبی کریں جو میرے دین سے

سرتابی کریں —— ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ﴾ ''تا کہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر غیب میں رہتے ہوئے بھی اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں''۔ اللہ کی مدد کیا ہے! اس کے نازل کردہ دین کی سربلندی اور اس کا نفاذ —— رسول کی مدد کیا ہے! اس کے لائے ہوئے دین کی سربلندی اور اس کا نفاذ —— آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ بذاتہٖ قوت والا اور زبردست ہے۔ غالب ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ تمہاری مدد ہوگی تو اس کا دین قائم و نافذ ہوگا سربلند ہوگا۔ اس کی تکوینی حکومت اس کائنات کے ذرے ذرے پر مستولی ہے۔ اس دنیا میں اس کا تشریعی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری بغرض امتحان ان لوگوں کے سپرد کی گئی ہے جو اس پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے کے مدّعی ہیں۔ وہ دیکھنا اور جانچنا چاہتا ہے کہ یہ مدعیانِ ایمان اللہ کے دین کی تنفیذ کے لیے اپنے تن من دھن کی قربانی کے لیے بھی تیار ہیں یا نہیں —— اس کے لیے یہ ضرور ہے کہ اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے ہمیں سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جو تدریج ملتی ہے اسے ملحوظ رکھا جائے۔ بصورت دیگر فساد رونما ہو جائے گا۔ فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ بارہ برس تک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضور ﷺ نے مار کھانے کی مشق کرائی ہے اور خود ماریں کھائی ہیں۔ صحابہؓ نے نہایت بہیمانہ مظالم کو برداشت کیا ہے اور دشمنوں میں سے کسی کا بال تک بیکا نہیں کیا —— نہ یہ کیا کہ ہاتھ میں ہتھوڑا پکڑ کر خانہ کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے ان کو توڑنا شروع کر دیتے —— پورے نظم وضبط کے ساتھ اپنے ہاتھ بندھے رکھے۔ یہ تمام باتیں سیرت مطہرہ کی روشنی میں جملہ مراحل انقلابِ اسلامی کے بیان میں آٹھ دس تقریروں کے ذریعے آپ کے سامنے میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔[1]

اسی نصرت کے تذکرہ کی آیت پر سورۃ الصّف ختم ہوتی ہے۔ وہاں بھی دو نصرتوں کا بیان ہے۔ ایک اللہ کی نصرت دوسری رسول کی نصرت۔ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو''۔ یہاں زور دار دعوت کا اسلوب ہے۔ آگے فرمایا: ﴿كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾۔ جیسے کہ یاد کرو چھ سو برس قبل عیسیٰ ابن مریمؑ نے صدا لگائی تھی —— حضور ﷺ پر وحی کا آغاز ۶۱۰ عیسوی میں

(۱) الحمدللہ یہ تقاریر ''منہج انقلابِ نبوی ﷺ'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں (مرتب)

ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ میں چھ صدیوں کا فصل ہے ——— تو فرمایا کہ جیسے آج ہمارا آخری رسول تمہیں پکار رہا ہے کہ مدد کرو اللہ کی اور مدد کرو میری۔ اسی طرح چھ سو برس قبل آواز لگی تھی اور حضرت عیسیٰؑ ابن مریم نے اپنے حواریین کو پکارا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف' میں نے تو دعوت اِلی اللہ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تو اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لیے آگے بڑھ رہا ہوں۔ اب کون ہے جو میرا مددگار اور ساتھی بنے۔ میرے اعوان وانصار میں شامل ہو۔ یہ ندا تھی حضرت مسیح علیہ السلام کی کہ ﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ﴾۔ اللہ کے کام میں' اللہ کے دین کے لیے کون معین ومعاون بنتا ہے۔ دیکھئے دو نسبتیں آ گئیں مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ کون ہے میرا مددگار۔ اور اِلَی اللّٰہِ' اللہ کی طرف یعنی اللہ کے دین کے لیے—— اس کے بعد تاریخ کی ایک جھلک دکھائی گئی۔ تمہیں یاد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت قبول کرنے والے کتنے کم تھے—— بارہ تو وہ تھے جن کو حواری کہا جاتا ہے اور جو ہر وقت آنجنابؑ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ان میں سے ایک غداری کر گیا تھا۔ دوسرا پیٹر تھا جس نے جب بہت ہی وفاداری اور عقیدت مندی کا اظہار کیا تھا تو حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا کہ 'پیٹر! صبح مرغ کی بانگ سے پہلے پہلے تم دو یا تین مرتبہ میرا انکار کرو گے''۔ تو جب حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرنے کے لیے رومی فوج کے دستے نے ایک حواری کی غداری اور مخبری کی وجہ سے آپ کی پناہ گاہ پہنچ کر پکڑ دھکڑ شروع کی تو پیٹر جزع فزع کرنے لگا۔ اس نے آنجنابؑ سے بے تعلقی کا اظہار کیا' آپؑ کے حواری ہونے سے انکار کیا۔ یہ تمام باتیں موجودہ اناجیل میں مذکور ہیں۔ اب رہ گئے دس حواری تو حضرت مسیح کے رفع آسمانی (اور عیسائیوں کے بقول مصلوب ہونے) کے بعد ان سے اب جو دعوت شروع ہوئی تو اس نے جڑ پکڑنی شروع کی ان حواریوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان کی دعوت پر ایمان لانے والوں کو زندہ آگ میں جلایا گیا۔ لیکن حق کا چراغ روشن سے روشن تر ہوتا گیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿کَمَا قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ لِلۡحَوَارِیّٖنَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ کَفَرَتۡ طَّآئِفَۃٌ ۚ﴾ ''جیسے کہ عیسیٰ نے پکارا حواریوں کو کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف تو حواریوں نے لبیک کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کی روش اختیار کی'' ﴿فَاَیَّدۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلٰی عَدُوِّہِمۡ﴾ ''پس ہم نے ان اہل ایمان کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی'' ﴿فَاَصۡبَحُوۡا ظٰہِرِیۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ پھر وہی اہل ایمان غالب ہوئے''

—— وہی بات آ گئی۔اِنۡ تَنۡصُرُوااللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ —— اور اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ۔

سورۃ الصّف کی اس آخری آیت میں اہل ایمان کے لیے اللہ کے دین کی نصرت کی پُرزور دعوت آ گئی۔فرمایا جارہا ہے کہ اے مسلمانو! تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔پھر ہمارا رسول ہے جو تمہیں اللہ کے دین کی نصرت کے لیے پکار رہا ہے۔آؤ اللہ کے دین توحید کے قیام ونفاذ کے لیے اس کے دست وبازو بنو —— مجھے بے ساختہ اقبال کا یہ شعر یاد آ گیا۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

تاریخ تو اپنے آپ کو دہراتی رہے گی۔آج ہم میں سے ہر شخص کی سعادت اسی میں ہے کہ اس پکار کو کھلے کانوں سے سنے اور کھلے دل سے قبول کرے۔

یہ ہے وہ تیر بہدف (sure shot) اور مجرب نسخہ۔تم اللہ کے دین کی مدد میں لگو اللہ تمہارے دنیا کے تمام معاملات کا ذمہ خود لے گا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ یَنۡصُرۡکُمۡ وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ﴾ —— اور ﴿اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ ۚ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ﴾

بَارَكَ اللّٰهُ لِیۡ وَلَكُمۡ فِی الۡقُرۡآنِ الۡعَظِیۡمِ وَنَفَعَنِیۡ وَاِیَّاكُمۡ بِالۡاٰیَاتِ وَالذِّكۡرِالۡحَكِیۡمِ

۞۞۞